ہماری عزاداری

قرآن و سُنّت کے آئینہ میں

تالیف

محقّقِ کبیر شیخ عبدالحسین الامینی طاب ثراہ

ترجمہ:

علاّمہ السیّد ذیشان حیدر جوادی طاب ثراہ

ناشر:

ادارہ تعلیم و تربیت لاہور

نام کتاب: ہماری عزاداری
تالیف: علامہ عبدالحسین الامینی طاب ثراہ
تحریر و ترجمہ: علامہ السید ذیشان حیدر جوادی طاب ثراہ
کتابت: ج۔ احمد
سنۂ طباعت: جنوری ۲۰۰۵ء
تعداد: ایک ہزار
ناشر: ادارہ تعلیم و تربیت لاہور

ملنے کا پتہ

مکتبہ الرضا

میاں مارکیٹ غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور 7245166

حیدری کتب خانہ

اندرون کربلا گامے شاہ بیرون بھاٹی گیٹ لاہور

042-7113176-0345-4563616

فہرست مضامین

حرفِ مترجم ۵
یادگار ۶
اصول استدلال ۹
مراسمِ عزاء ۱۱
مجسمہ سازی ۱۷
ایذاءِ نفس ۲۰
ہم زندۂ جاوید کا ماتم نہیں کرتے ۲۸
گریہ ۳۱
مجلس ۳۷
ماتم ۳۸
سوز خوانی ۴۳
باجہ ۵۰
وجوہِ خیرات ۵۱
نذرانہ ۵۴
مبارک سفر ۶۱
تمہید ۶۲
موقفِ حساب ۷۳
دعوتِ مطالعہ ۷۸
نتیجۂ کلام ۸۱
حسینؑ۔ عزاداری۔ کربلا ۸۴
ماتمِ میلاد ۸۹
ماتمِ رضاعت ۹۲
سالانہ ماتم ۹۹
اُمِّ سلمہ کے گھر ماتم (مجالس) ۱۰۲
اُمّ المومنین عائشہ کے گھر صفِ ماتم ۱۱۸
اُمِّ سلمہ کے گھر دوسری صفِ ماتم ۱۲۸
زینب بنت جحش کے گھر صفِ ماتم ۱۳۲
اُمِّ سلمہ کے گھر میں صفِ ماتم ۱۳۵
اُمّ المومنین عائشہ کے گھر۔۔۔ ۱۴۹
امیر المومنین علیؑ کے گھر صفِ ماتم ۱۵۵
مجمعِ اصحاب میں ماتم ۱۵۷
بیت الشرف رسالت میں ماتم ۱۶۴
کربلا میں امیر المومنینؑ کی صفِ عزاء ۱۶۵
ماتم یوم عاشورہ ۱۷۳
منزلِ آخر ۱۸۶
وظائف و اعمال ۱۸۹

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حرفِ مترجم

عزاداری اس عظیم قربان گاہ کی یاد آوری کا ذریعہ ہے جہاں ایک بندۂ خدا نے دینِ خدا کی بقا کے لئے اپنا سارا گھر لٹا دیا تھا اور اس کے طفیل میں دین کی بقائے دوام کا انتظام کر دیا تھا۔

کربلائے حسینؑ کی یاد جذبۂ ایثار و قربانی کی تربیت ہے اور قربانیٔ امام حسینؑ کا تذکرہ بقائے دینِ الٰہی کی ضمانت ہے۔ ضرورت ہے کہ اُمّتِ اسلامیہ اس قربانی کی یاد کو تازہ رکھے اور ہر اس وسیلہ کو اختیار کرے جس سے یہ یاد تازہ رکھی جا سکتی ہے۔

یاد اور یاد آوری کی اہمیت ہی کا تقاضا تھا کہ مالکِ کائنات نے مرسلِ اعظمؐ کو قانونِ شریعت عطا کرنے کے بعد اس بات پر اکتفا نہیں کی کہ پیغمبرؐ ان اصولوں کی تبلیغ کر کے مطمئن ہو جائیں اور ان کی تبلیغی ذمہ داریوں کا سلسلہ ختم ہو جائے ___ بلکہ تبلیغ کے ساتھ ان کی ایک ذمہ داری یہ بھی قرار دی کہ ان حقائق کی یاد دہانی کراتے رہیں۔

یاد دہانی نفسیات کی صالح و صحت مند تربیت کا بہترین ذریعہ ہے اور اسے بشری ذہنوں کی اصلاح میں بہت بڑا حصّہ حاصل رہا ہے۔

قرآن مجید کا کھلا ہوا اعلان ہے ___ "ذَكِّرۡ فَاِنَّ الذِّكۡرٰى تَنۡفَعُ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ" میرے حبیبؐ انھیں یاد دلاتے رہئے کہ یاد دہانی صاحبانِ ایمان کے لئے نفع بخش ہوتی ہے۔ یاد دہانی سے ذہنوں میں اصولِ زندگی روشن ہوتے رہتے ہیں اور ذہنوں کی روشنی کردار کی تعمیر کا بہترین وسیلہ ہوتی ہے۔

آیتِ کریمہ میں تذکرہ کے متعلقات کا ذکر نہیں کیا گیا ہے اور نہ یہ بتایا گیا ہے کہ

مرسلِ اعظمؐ کو کن باتوں کی یاد دہانی کرانا ہے اور اس کے لئے کن وسائل کو اختیار کرنا ہے لیکن غرض و غایت کے بیان سے اتنا ضرور واضح ہوگیا ہے کہ یاد دہانی سے مُراد صرف ان اشیاء کا تذکرہ ہے جو صاحبانِ ایمان کے لئے مفید ہوں اور اس سلسلہ میں ان تمام وسائل و ذرائع کی اجازت ہے جو یاد دہانی کے لئے مفید طلب ثابت ہو سکتے ہوں۔

بشریت کی تاریخ گواہ ہے کہ ایمانی منفعت کے لئے کربلا سے بالاتر کوئی واقعہ اور امام حسینؑ جیسی عظیم ہستی کے کردار سے بلند تر کوئی کردار نہیں ہے۔ اس لئے ہر دیانتدار مؤرخ کی ذمہ داری ہے کہ وہ امام حسینؑ کے کردار کو اجاگر کرے تاکہ قومی وقار سلامت رہے اور معارفِ دین کو یادآوری کا وسیلہ ملتا رہے۔

مراسمِ عزا در اصل انھیں واقعات و حقائق کی یاد کا ذریعہ ہیں اور ان سے انھیں اہم حقائق کی یاد دہانی کا کام لیا جاتا ہے۔ ان کی یادگار یادِ الٰہی کا ذریعہ اور ان کا تذکرہ دنیائے ایمان کے لئے منفعت بخش ہے۔

مراسمِ عزا کے شرعی حدود طے کرنے کے لئے اس نکتہ کی طرف توجہ دینا ضروری ہے کہ شریعتِ اسلام جن ارشادات و اعمال کا مجموعہ ہے وہ آیاتِ قرآن اور سنّتِ رسولِ اکرمؐ ہے اور دونوں کی تشریح و تعبیر میں بے شمار اختلافات پائے جاتے ہیں۔ ایک مکتبِ خیال یہ ہے کہ مقامِ تعبیر میں معصوم افکار پر اعتماد کرنا چاہیئے اور اپنے ناقص اذہان کو دخیل نہیں بنانا چاہیئے جسے شیعہ مکتبِ فکر سے تعبیر کیا جاتا ہے ـــ اور دوسرا مکتبِ خیال یہ ہے کہ انسان کو صرف اپنے افکار و آراء پر اعتماد کرنا چاہیئے اس میں کسی معصوم یا غیر معصوم پر اعتماد کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ مکتبِ خیال سُنّی مکتبِ فکر سے یاد کیا جاتا ہے۔

مجھے ذیل میں ہر مناظرہ و مجادلہ سے قطعِ نظر کر کے صرف معصوم تعبیرات پر اعتماد کرنا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بعض مقامات پر غیر معصوم تعبیروں کی طرف بھی اشارہ کر دیا جائیگا تاکہ دوسرے مکتبِ خیال کے افراد بھی استفادہ کر سکیں اور انھیں بھی نورِ بصیرت حاصل ہو سکے۔

یادگار:

انسانیت کی مسلسل تاریخ گواہ ہے کہ روئے زمین پر قدم رکھنے والے انسان دو طرح

کے ہوتے ہیں۔

کچھ افراد وہ ہوتے ہیں جو ذاتی اغراض اور شخصی مصالح کے لئے زندگی کو وقف کرکے حیات کے دن گذار لیا کرتے ہیں اور اسی کو معراج زندگی تصوّر کرتے ہیں۔

اور کچھ افراد وہ ہوتے ہیں جن کی زندگی اصول، مقصد، کردار اور خدمتِ قوم و ملّت کے لئے وقف ہوتی ہے اور ان کا نصب العین اصولِ حیات کی خدمت اور بلند کردار کی تعمیر ہوتا ہے۔

ایسے ہی افراد تاریخ میں زندہ و پائندہ ہوتے ہیں اور انھیں کا نام صفحۂ تاریخ پر روشن رہتا ہے۔

تاریخ کے صفحات پر نام کا زندہ رہ جانا اگرچہ انسانیت کی معراج نہیں ہے کہ بلند کردار افراد نام و نمود کے لئے کام نہیں کیا کرتے ہیں لیکن یہ ایک علامت ضرور ہے کہ جانے والے نے اپنے پیچھے کوئی کردار اور کوئی تذکرہ چھوڑا ہے۔

حیرت ان مادّیت پرست انسانوں پر ہے جو مذہب کی اعلیٰ قدروں کے انکار کے باوجود تاریخ کے روشن صفحات پر نام ثبت کرانے اور سنہرے حروف سے اپنا تذکرہ لکھوانے کی خاطر سر و تن کی بازی لگا دیتے ہیں اور انھیں احساس بھی نہیں ہوتا ہے کہ اگر مادّیت ہی سب کچھ ہے اور مذہب اور روحانیت کی اعلیٰ اقدار کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اگر یہ کائنات ایک اتفاقی حادثہ ہے۔ یہ اخلاقیات ایک ارجوازی مفروضہ ہیں۔ یہ اجرِ آخرت ایک مذہبی مزعومہ ہے تو خاک کا ڈھیر بن جانے کے بعد صفحاتِ تاریخ پر زندہ رہ جانے کی کیا حقیقت ہے۔ جو لوگ روح کے وجود کے قائل ہیں وہ کم از کم یہی سوچ کر تسکین حاصل کر لیتے ہیں کہ عالمِ ارواح سے اپنے بلند تذکروں کو دیکھ کر مسرور ہوں گے یا عالمِ برزخ سے ان تذکروں کا مشاہدہ کرکے سکون حاصل کریں گے۔ لیکن مادّیت پرستوں کے مقدر میں تو یہ سکون بھی نہیں ہے۔

زندہ قوموں کی ایک زندہ علامت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے بزرگوں کی یاد تازہ رکھتی ہیں اور ان کی یادگاریں قائم کرکے اپنی زندگی کا ثبوت دیتی ہیں۔ وہ قوم کتنی احسان فراموش

ہوتی ہے جو اپنے پیش رو افراد کو نظر انداز کر دیتی ہے اور اپنی ترقی کے لئے کوئی عملی کردار نگاہوں کے سامنے نہیں رکھتی ہے۔

یادگاروں کا سلسلہ ہر قوم میں، قوم کی زندگی کا ثبوت اور بلند عزائم کی نشاندہی کا ذریعہ ہے۔

وہ قومیں انتہائی بد نصیب ہوتی ہیں جن کے سامنے ترقی کا کوئی نشانہ نہیں ہوتا ہے اور وہ معاشرے انتہائی بد بخت ہوتے ہیں جو اپنے پیش رو افراد کے کردار کو بھلا دیا کرتے ہیں۔

اقوامِ عالم میں ملّتِ اسلامیہ کی سب سے بڑی امتیازی صفت یہی ہے کہ اس کے پاس ارتقائے بشر اور معراجِ انسانیت کے ایسے نشانے موجود ہیں جن سے بالاتر منازل کا تصوّر نہیں ہو سکتا ہے۔ اس نے اپنی تاریخ میں ایسے بلند کردار پیش کئے ہیں جن کو پیشِ نگاہ رکھنے کے بعد کسی قوم کی تاریخ کے مطالعہ کی ضرورت نہیں رہ جاتی ہے۔

مذہب نے انھیں نکات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے قرآن کریم میں بار بار "وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ" کی تاکید کی ہے۔ میرے حبیب ابراہیمؑ کو یاد کیجئے ـــ نوحؑ کو یاد کیجئے ـــ اسماعیلؑ کو یاد کیجئے ـــ موسیٰؑ کو یاد کیجئے ـــ عیسیٰؑ کو یاد کیجئے ـــ مریمؑ کو یاد کیجئے۔

یہ تذکرے قوم کی زندگی کی ضمانت اور کردار کے اعلیٰ نمونے ہیں ـــ آپ انھیں سامنے رکھ کر اپنی قوم کو ارتقار کے نشیب و فراز سے باخبر بنا سکتے ہیں اور انھیں بتا سکتے ہیں کہ کفر و ضلالت کے ماحول میں راہِ راست کی دعوتِ خیر تنہا میرا عمل نہیں ہے بلکہ یہ ہمیشہ سے مردانِ باخدا کا شعار رہا ہے اور دہریت و الحاد کی آندھیوں میں شمعِ ایمان کا جلائے رکھنا تنہا تمھاری ذمہ داری نہیں ہے بلکہ تم سے پہلے والے بھی اس ذمہ داری کو ادا کر گئے ہیں۔

تمھارے سامنے ابراہیمؑ کا اعلانِ توحید ـــ نوحؑ کی دعوتِ حق ـــ اسماعیلؑ کی صداقت و قربانی ـــ موسیٰؑ کے مجاہدات ـــ عیسیٰؑ کے مصائب اور مریمؑ کی عصمت و عفّت رہنی چاہیئے تاکہ انھیں تذکروں کی روشنی میں اپنے کردار کو اعلیٰ مدارج سے

ہمکنار بنا سکو۔

اسلامی عبادات کا جائزہ بھی اسی بات کا زندہ ثبوت ہے کہ ان کی تشریع بھی یادِ الٰہی کو مستحکم اور پائیدار بنانے ہی کے لئے ہوئی ہے۔ ان احکام کا بلند ترین مقصد بھی ہے کہ جس پاکیزگیِ افکار کو عقائد و معارف نے ایجاد کیا ہے وہ عملی زندگی میں سرایت کر جائیں اور مسلسل اعمال کی بنیاد پر ذہنوں میں پائندہ اور تابندہ ہو جائیں۔ حج کے اعمال اس حقیقت کی روشن دلیل ہیں جن میں جناب ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کے ساتھ جناب ہاجرہ کے کردار کی بھی یادگار قائم کی گئی ہے اور یہ ایک طرح کی یاد دہانی ہی ہے کہ ہماری راہ میں سعی کرنے والوں کے کردار کا زندہ رکھنا ہماری ذمہ داری ہے اور اس کی تاسی تمھاری دیانت کی روح اور تمھارے عقیدہ کی جان ہے۔

اصولِ استدلال:

کسی مطلب کے نفی و اثبات سے پہلے یہ طے کر لینا ضروری ہے کہ اس کا تعلق کس موضوع سے ہے اور اس کے اصولِ استدلال کیا ہیں؟

عقلیات کے اصول استدلال مسلمات عقلیہ ہیں۔ اخلاقیات کے اصولِ استدلال اعلیٰ اقدار ہیں۔

سیاسیات کے اصولِ استدلال سیاسیات کے مسلمات ہیں اور شرعیات کے اصولِ استدلال ادلۂ شرعیہ ہیں۔

مراسمِ عزا کا تعلق نہ عقلیات سے ہے اور نہ سیاسیات سے۔ اس کا تمام تر ربط امورِ شرعیہ سے ہے لہٰذا اس کے نفی و اثبات کے لئے شریعت ہی کا سہارا لینا پڑے گا اور جذبات کی ہم آہنگی یا توہمات کی مخالفت مسئلہ کی دلیل نہیں بن سکتی ہے جب تک یہ نہ ثابت ہو جائے کہ شریعتِ مقدسہ نے ان جذبات کا احترام کیا ہے یا ان مزعومات کو قابلِ اعتنا نہیں قرار دیا ہے۔

شرعی مسائل پر استدلال کرنے کے لئے علمائے اعلام نے چار بنیادیں قرار دی ہیں: قرآن۔ سُنّت۔ اجماع۔ عقل۔

ان کے علاوہ قیاس۔ استحسان۔ مصالح مرسلہ۔ عمل اہلِ مدینہ وغیرہ اختلافی بنیادیں ہیں لہٰذا ان کا محلِ بحث میں لے آنا بیکار اور اصولِ استدلال کے منافی ہے۔

مذکورہ چاروں میں اجماع کا کوئی محل اس لئے نہیں ہے کہ مسئلہ محلِ اختلاف بن چکا ہے اور اختلافی مسائل میں اجماع کا نام لینا خلافِ عقل و منطق ہے۔ باقی رہ جاتے ہیں قرآن و سنّت و عقل۔

عقل سے مراد وہ فیصلے نہیں ہیں جو شرعی نصوص سے ہٹ کر ہوا کرتے ہیں بلکہ اس سے مراد وہی فیصلے ہیں جن کا تعلق شرعی نصوص پر عمل درآمد کرنے سے ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر کسی مسئلہ میں شرعی نص ثابت نہ ہو سکی اور یہ طے کرنا ضروری ہو گیا کہ یہ امر جائز ہے یا ناجائز تو عقل کا کھلا ہوا فیصلہ ہے کہ بندہ اپنے عمل میں آزاد ہے کہ بیان کے بغیر عقاب کرنا خلافِ شانِ عدالت ہے۔ اور عدالت، رب العالمین کی مسلّمہ صفتِ کمال ہے جس سے انحراف کا تصور نہیں ہو سکتا ہے۔

یہی حال عقل کے دوسرے فیصلوں کا بھی ہے جہاں شریعت کے احکام پر عمل درآمد کے اصول معین کئے جاتے ہیں۔ چاہے وہ احتیاط کی شکل میں ہوں یا تخییر کی صورت میں ہوں یا زیرِ نظر مسئلہ میں عقل کے جس فیصلہ سے مدد لی جا سکتی ہے وہ قانونِ برائت ہی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر شریعت کی طرف سے کوئی پابندی ثابت نہ ہو تو انسان میدانِ عمل میں مختارِ کُل ہے۔ اسے فعل و ترک کے ہر پہلو پر مکمل اختیار حاصل ہے۔

عقل کا یہ فیصلہ ایک قسم کی شرعی حیثیت رکھتا ہے اور اسے شرعی نصوص کی تائید بھی حاصل ہے۔ لہٰذا اس وقت زیرِ بحث شرعی دلائل سے مُراد قرآن و سُنّت ہی ہیں۔

قرآن سے مراد وہ مقدّس کتاب ہے جو حضور سرورِ کائنات پر بطور معجزہ نازل ہوئی تھی اور جسے اسلام کے عظیم الشان نظام کا دستور بنایا گیا تھا۔ اس کتاب کا ایک ایک حرف سند اور ایک ایک کلمہ حُجّت ہے۔ کسی مسلمان کو یہ حق نہیں ہے کہ اس کے ایک حرف سے بھی انکار کر سکے۔

مقامِ تاویل و تفسیر میں ہزار اختلاف کی گنجائش ہے لیکن مقامِ تسلیم و اعتراف میں کسی انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

سنت کے مفہوم میں اسلام کے مختلف فرقوں میں کسی قدر اختلاف ضرور پایا جاتا ہے کہ سُنّی مکتبِ فکر کا خیال ہے کہ سُنّت صرف حضور اکرمؐ کے قول وعمل اور تقریر کا نام ہے اور شیعی عقیدہ کی بنا پر سُنّت کے دائرہ میں ہر معصومؑ کا قول وفعل اور تقریر داخل ہے چاہے وہ رسالت کے درجہ پر فائز ہو یا نہ ہو جیسے ائمہ اثنا عشرؑ۔

اس اختلاف کی بنیاد درحقیقت اس مسئلہ کا اختلاف ہے کہ اسلام میں حضور اکرمؐ کے علاوہ کوئی معصوم ہے بھی یا نہیں۔

سُنّی حضرات حضورؐ کے علاوہ کسی ہستی کو معصوم ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں اور شیعہ حضرات ائمہ اثنا عشرؑ کی عصمت کے قائل ہیں جس کے مختلف دلائل مختلف مقامات پر مذکور ہیں اور واضح ترین دلیل آیتِ تطہیر ہے جس میں قدرت نے اہلبیتؑ کے جملہ برائیوں سے پاک ہونے کا اعلان کیا ہے۔

اس اختلاف سے قطع نظر یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ علماء اہلسنّت اصحابِ رسولؐ کو غیر معصوم مانتے ہوئے بھی ان کے اقوال وافعال کو سند قرار دیتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ اہلبیتؑ کے اعمال و اقوال کو حجّت کا درجہ نہ دیا جائے جب کہ "اَصْحَابِی کَالنُّجُوْمِ" کی روایت علماء اہلسنّت کی تصریح کے مطابق بھی جعلی ہے اور "اِنِّی تَارِکٌ فِیکُمُ الثَّقَلَیْنِ کِتَابَ اللّٰہِ وَعِتْرَتِی اَھْلَ بَیْتِی مَا اِنْ تَمَسَّکْتُمْ بِھِمَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِیْ" کی حدیث فریقین میں متفقہ حیثیت رکھتی ہے اور اسے مستند اصحابِ صحاح ومسانید نے نقل کیا ہے۔

اس حدیث کی روشنی میں یہ بات واضح ہے کہ اہلبیتِ پیغمبرؐ کو معصوم مانا جائے یا نہ مانا جائے ــــ ان کے قول وعمل کو حجّت ضرور ماننا پڑے گا کہ یہی اُمّت کے لئے نجات کی ضمانت اور ہلاکت سے تحفّظ کا واحد ذریعہ ہیں۔

مراسمِ عزا:

دورِ حاضر کی ہندوستانی عزاداری میں جن مراسم کو زیادہ اہمیت حاصل ہے وہ حسب ذیل ہیں:

رونا۔ رُلانا۔ رونے والوں کی صورت بنانا۔ سینہ زنی۔ شمشیر زنی۔ زنجیر۔ آگ کا ماتم۔ نوحہ۔ مرثیہ۔ سوز۔ ذوالجناح۔ عَلم۔ تابوت۔ تعزیہ۔ عماری۔ سبیل۔ تبرک۔ نذر وغیرہ۔

مہندی کی حیثیت اختلافی ہے۔ اس لئے اس پر بحث کرنے کے لئے اصل عقد قاسمؑ کے موضوع پر بحث کرنا ہوگی جس کا دامن کافی وسیع ہے اور بظاہر اس کا محل بھی نہیں ہے۔ لہٰذا اگر مہندی میں یہ تصور شامل کر لیا جائے کہ ماں باپ اور چچا کے دل میں ایک تمنائے عقد تھی جو پوری نہ ہو سکی۔ جس طرح کہ حضرت عبّاس سقاء کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے کہ آپ کے قلبِ نازنین میں بچّوں کو سیراب کرنے کی آرزو تھی اور آپ نے اس کے لئے ہر امکانی کوشش بھی کی لیکن قضائے الٰہی نے ارادہ کو پورا نہ ہونے دیا اور آپ یہ حسرت لے کر دنیا سے تشریف لے گئے۔

تجزیہ:

مذکورہ مراسمِ عزا پر بحث کرنے سے پہلے ان کا تجزیہ کر لینا ضروری ہے تاکہ بحث میں زیادہ پھیلاؤ نہ پیدا ہو اور خلطِ مبحث سے بچتے ہوئے ہر شئے کو اس کی اصلی جگہ پر رکھا جا سکے۔

اس تجزیہ کے تحت دو چیزیں آتی ہیں۔ ایک مراسمِ عزا کی نوعیت اور ایک ان کا اصل واقعہ سے تعلق۔

نوعیت کے اعتبار سے ان مراسم کی پانچ قسمیں ہیں:

۱۔ فطرت: اس ذیل میں گریہ۔ ماتم۔ مجلس۔ نوحہ اور مرثیہ جیسے امور آتے ہیں جو ایک سوگوار کے فطری تقاضے ہوتے ہیں اور ہر مصیبت زدہ کا دل چاہتا ہے کہ اپنے غم میں آنسو بہائے، دوسروں کو شریکِ غم بنائے۔ شدّتِ غم میں سر و سینہ پیٹے اور زبانِ مقال سے اپنے مصائب کا اظہار کرے۔

۲۔ بشری مصنوعات: اس فہرست میں عَلم۔ تابوت۔ تعزیہ۔ ضریح عماری وغیرہ کا نام آتا ہے۔ ذوالجناح اس فہرست سے خارج ہے کہ اس میں کوئی صنعت

نہیں ہوتی ہے بلکہ ایک گھوڑے کو حضرت امام حسینؑ کے گھوڑے کی شبیہ بنانا ہوتا ہے جسے مجسمہ سازی سے بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔

۳۔ **شدّتِ تاثر:** اس عنوان میں زنجیر اور شمشیر کا ماتم داخل ہے جو ہر اُس سوگوار کا طرزِ عمل ہو سکتا ہے جو شدّتِ تاثر سے از خود رفتہ ہو جائے اور اس کے سامنے یہ آلات موجود ہوں۔

۴۔ **اعمالِ خیر:** اس موضوع میں سبیل۔ تبرّک۔ نذر وغیرہ کا ذکر آتا ہے جو صرف مراسمِ عزا سے مخصوص نہیں ہیں بلکہ کسی وقت بھی ان کا استعمال ہو سکتا ہے۔

۵۔ **اعلانِ غم:** اس کام کے لئے ان وسائل کا استعمال ہوتا ہے جو دور افتادہ لوگوں کو مجلسِ غم سے آگاہ کر دیتے ہیں جس طرح کہ اسلام میں اعلانِ نماز کے لئے اذان دی جاتی ہے۔

واقعہ سے تعلق کے اعتبار سے بھی ان مراسم کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: ایک وہ حصّہ ہے جو واقعۂ کربلا سے مربوط ہے اور دوسرا وہ حصّہ ہے جسے اصل واقعہ سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ وہ مقامی حالات کی پیداوار ہے۔

پہلی قسم میں اکثر مراسمِ عزا آتے ہیں اور دوسری قسم میں صرف سوز خوانی، تبرّک۔ آگ کا ماتم اور مہندی کا نام لیا جا سکتا ہے کہ ان کا بظاہر واقعات سے کوئی تعلق نہیں ہے ــــ اگرچہ یہ ممکن ہے کہ باجہ کو اس جنگی باجہ کی یادگار فرض کر لیا جائے جو عموماً میدانِ جنگ میں بجایا جاتا ہے اور مہندی کو حسرتِ عقدِ قاسمؑ کی یادگار مان لیا جائے اور آگ کے ماتم کو اس اندوہ ناک منظر کی تصویر کشی تسلیم کر لیا جائے جب امام حسینؑ کے خیام میں آگ لگی ہوئی تھی اور سیدانیاں چھوٹے چھوٹے بچّوں کو لئے جلتی آگ میں ایک خیمہ سے دوسرے خیمہ کی طرف دوڑ رہی تھیں۔

یہ اور بات ہے کہ ان چیزوں کا رواج غالباً ان بنیادوں پر نہیں ہوا ہے بلکہ ان کے کچھ اور تاریخی یا سماجی اسباب تھے جن کے زیرِ نظر یہ چیزیں ظہور پذیر ہوئی ہیں اور میں نے انھیں علیحدہ سے اس لئے بیان کیا ہے کہ نفی و اثبات میں ان کا کوئی تعلق

دیگر مراسمِ عزا سے نہیں ہے ـــــ ان کی نفی دیگر مراسم کے اثبات کو متاثر نہیں کر سکتی ہے اور دیگر مراسم کا اثبات ان کے اثبات کا متقاضی نہیں ہے۔ بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ بہت سے مراسمِ عزا صرف عنوانِ عزا کی بنا پر مستحسن ہو جائیں اور یہ امور ان سے بھی علیحدہ رہ جائیں کہ ان پر عزا کا عنوان صادق نہیں آتا ہے بلکہ اظہارِ حق یا اعلانِ حقانیت کے لئے انھیں استعمال کیا جاتا ہے۔

بدعت:

مراسمِ عزا اور اس کے علاوہ بیشمار مذہبی امور کے انکار کے لئے اُمتِ اسلامیہ میں بدعت کا حسین ترین بہانہ پایا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ امورِ بدعت ہیں اور بدعت کے بارے میں سرکارِ دو عالم کا ارشادِ گرامی ہے کہ ہر بدعت ضلالت ہے اور ہر ضلالت کا انجام جہنّم ہے۔

ایسے افراد کی نظر میں بدعت سے مراد وہ تمام امور ہیں جو بعد مرسلِ اعظم ظہور پذیر ہوئے ہیں چاہے ان کا تعلق دین سے ہو یا دنیا سے اور اسی بنا پر نماز تراویح کو بھی بدعت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ اگر اس تعریف کی بنا پر اشیاء کو ضلالت و گمراہی قرار دے دیا جائے گا تو اس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہوگا کہ اسلام اپنے احکام میں زمانی تقسیم کا قائل ہے اور اس کا نظریہ یہ ہے کہ عہدِ پیغمبرؐ میں رونما ہو جانے والی ساری چیزیں حلال ہیں اور حضورؐ کے بعد ظہور پذیر ہونے والی تمام چیزیں حرام ہیں۔ اور بعد وفاتِ پیغمبرؐ پیدا ہونے والی چیزوں کا جُرم یہ ہے کہ وہ حیاتِ پیغمبرؐ میں کیوں نہیں تھیں اور عہدِ سرکار کی باتوں کو اس انعام میں حلال کر دیا جائے کہ سرکارؐ کے عہدِ سعادت عہد میں ظہور پذیر ہو گئی تھیں اور اس طرح آج کے ہر مسلمان کے وجود سے لے کر اس کے نفسِ آخر تک پوری حیات حرام رہے گی اور عیاشی۔ قمار بازی۔ شراب نوشی۔ بے ایمانی جائز ہو جائے گی کہ ان کا وجود سرکار کے عہد میں بھی تھا جب کہ کوئی مسلمان بھی اس بات کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہے۔ جیسا کہ تاریخ میں خلیفۂ دوم عمر بن الخطاب کا قول موجود ہے کہ دو متعہ سرکارؐ کے عہد

میں تھے اور میں انھیں حرام کر رہا ہوں۔

"حرام کر رہا ہوں" کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ حضورؐ کے بعد از خود حرام نہیں ہو گئے ہیں بلکہ انھیں حرام بنانے کی ضرورت محسوس کی گئی ہے۔

احکام کی یہ زمانی تقسیم ایک بے بنیاد مسئلہ ہے اور بدعت کی یہ تعریف شریعت کی دنیا میں ایک بے ربط تصوّر کے مترادف ہے۔

لغت میں بدعت کے یہ معنی ضرور ہیں لیکن لغت صرف الفاظ کا تصوّر پیش کرتا ہے۔ اس کا کام ان تصوّرات کے احکام کی حد بندی نہیں ہے۔

اسی لئے علماء اسلام کو یہ کہنا پڑا ہے کہ لغوی معنی کے اعتبار سے بدعت کی دو قسمیں ہیں: بدعت حسنہ اور بدعت سیئہ ــــ اور بعض علماء نے تو بدعت کے لئے پانچوں احکام ثابت کر دیئے ہیں کہ کبھی بدعت واجب ہو جاتی ہے اور کبھی حرام ــــ کبھی مباح و مکروہ ہوتی ہے اور کبھی مستحب۔

لہٰذا کسی شئے کا عہدِ رسالت کے بعد ظہور پذیر ہونا اس کے بدعت کہے جانے کا سبب بن بھی جائے تو اس کی حُرمت کا سبب نہیں بن سکتا ہے جیسا کہ حدیث شریف میں ضلالت کا لفظ اشارہ کرتا ہے کہ بدعت سے مراد ایسے امور ہیں جن پر ضلالت کا اطلاق جائز ہو ــــ ورنہ اُمّتِ اسلامیہ میں تو ہدایت کا انتظام ہی سرکار کے بعد سے شروع ہوا ہے تو کیا اس قانون کی بنا پر یہ فیصلہ کر لیا جائے گا کہ مسئلہ خلافت بھی ہدایت کا وسیلہ نہیں ہے بلکہ بدعت ہونے کے اعتبار سے ضلالت اور گمراہی کا ذریعہ ہے۔؟

جیسا کہ سرکارِ دو عالمؐ نے وقتِ آخر اُمّت کو اہلبیتؑ کے اتباع کی دعوت دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ اگر تم قرآن و اہلبیتؑ سے تمسک کرو گے تو "لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِیْ" میرے بعد بھی گمراہ نہ ہو گے ــــ یعنی تمھیں کوئی ایسا کام نہیں کرنا پڑے گا جو خود ضلالت اور گمراہی کا سبب ہو۔

خلیفہ دوم عمر ابن الخطاب نے بھی اسی امر کی طرف اشارہ کیا تھا کہ "ابوبکر کی خلافت ایک ناگہانی حادثہ تھی جس کے شر سے اللہ نے مسلمانوں کو بچا لیا لیکن اب ایسی خلافت

جائز نہیں ہے۔"

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود خلیفہ دوم بھی ایسی بدعتوں کو شر ضلالت اور گمراہی سے تعبیر کیا کرتے تھے۔

بدعت کی بحث میں اس حقیقت کی طرف متوجہ کر دینا بھی ضروری ہے کہ اُمّتِ اسلامیہ نے بدعتوں پر پابندی عائد کرنے کی ذمّہ داری لے کر دنیا کے سارے مسائل کو بدعت قرار دے دیا ہے لیکن ایک عظیم بدعت کی روک تھام کی کوئی کوشش نہیں کی ہے جس سے احکامِ قرآن کی تباہی، حدیثِ رسولؐ کی مخالفت اور اُمّت کی گمراہی کے راستے کھُل گئے ہیں ـــــ سرکارِ دو عالمؐ کا کھُلا ہوا ارشاد تھا جو کتب حدیث میں موجود ہے کہ خبردار میرے اوپر ناقص صلوات مت پڑھنا بلکہ صلوات میں میرے ساتھ آل کو بھی شامل کر لینا اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ۔ (صواعق محرقہ)

لیکن اُمّتِ اسلامیہ نے چند مقامات کے علاوہ ہر جگہ صلوات سے آلِ رسولؐ کا نام نکال دیا ہے اور اب تقریر و تحریر میں صرف "صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ" باقی رہ گیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اس بدعت کے ذریعہ سرکارِ دو عالمؐ کے حکم کی صریحی مخالفت ہو رہی ہے اور اُمّتِ اسلامیہ اس کی روک تھام کرنے کے بجائے خود مبتلائے بدعت نظر آ رہی ہے۔

ضرورت ہے کہ کچھ اربابِ غیرت و ہمت اُٹھیں اور دنیا کو یہ بتائیں کہ ذاتی مفاد اور شخصی مصالح ـــــ سیاسی تقاضے ـــــ سماجی علیحدگی احکامِ خدا و رسولؐ کو پامال نہیں کر سکتی ہے۔ ہمیں بدعتوں کا قلع قمع کر کے سرکارؐ کی سیرت و سنّت کو زندہ کرنا ہے اور اس کا پہلا قدم یہ ہے کہ صلوات میں حضور اکرمؐ کے اسم گرامی کے ساتھ آپ کی آلِ پاک کو شامل کر لیا جائے۔

بدعت کے دوسرے معنی ہیں "دین میں کسی ایسی چیز کا داخل کر دینا جس کا شمار دین میں نہیں ہے اور نہ اس کے جواز پر کوئی شرعی دلیل ہے۔"

ظاہر ہے کہ اس معنی کے اعتبار سے بدعت کو ضلالت۔ گمراہی۔ حرام۔ ناجائز

سب کچھ کہا جاسکتا ہے کہ یہ خدا و رسولؐ پر افترا ہے اور افترا ایک عام انسان پر بھی جائز نہیں ہے چہ جائیکہ رب العالمین پر۔

مراسم عزا کو اس اعتبار سے بدعت کہنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ جملہ نصوص آیات و احادیث پر نظر کرنے کے بعد یہ ثابت کیا جائے کہ یہ مراسم، آیات و احادیث کے مفاد کے خلاف اور روحِ اسلام کے منافی ہیں اور جب تک یہ بات ثابت نہ ہو جائے اُس وقت تک ان مراسم کو حرام و بدعت کہنا جائز نہ ہوگا بلکہ یہ الزام خود ایک قسم کی بدعت ہوگا کہ کسی جائز کو ناجائز کہنا بھی اسی طرح بدعت ہے جس طرح کسی ناجائز کو جائز قرار دیدینا بدعت ہے۔

ہماری ساری بحث کا تعلق انھیں نصوص و ارشادات سے ہوگا جن سے مراسم عزا کی تائید ہوتی ہے اور صاف واضح ہوتا ہے کہ ان امور میں حرمت کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

واضح رہے کہ ہماری بحث میں صرف آیات اور احادیثِ پیغمبر اسلامؐ سے استدلال نہ ہوگا بلکہ ان اہلبیتِ اطہارؑ کے ارشادات بھی پیش کئے جائیں گے جو بنصِّ قرآن طیب و طاہر ـــــ اور بفرمانِ رسولِ اکرمؐ شریکِ قرآن اور ضامنِ نجات ہیں۔

اس کے علاوہ جابجا بعض "صحابہ کرام" کے اقوال بھی نقل کئے جائیں گے جن کی شرعی حیثیت اگرچہ ثابت نہیں ہے لیکن بہرحال مسلمانوں میں ایک مکتبِ خیال ایسا ہے جو انھیں غیر معصوم تسلیم کرنے کے باوجود ان کے فرمودات کو اتنی ہی اہمیت دیتا ہے جتنی اہمیت حضرات معصومینؑ کے ارشادات کو حاصل ہے۔ "بَلْ هُمْ اَشَدُّ"

مجسمہ سازی:

مراسم عزا میں بعض چیزیں ایسی ہیں جن کے بارے میں حرام ہونے کا شبہ تجسیم کے تصوّر سے پیدا ہوتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام میں مجسمہ سازی حرام ہے اور یہ مراسم مجسمہ سازی کی ایک قسم ہیں لہٰذا انھیں بھی حرام ہونا چاہیئے۔

اس سلسلے میں کتب فریقین میں چند روایتیں پائی جاتی ہیں، جن کا نقل کردینا ضروری ہے۔

صحیح بخاری ۲/۲۴ میں ابن عباس نے رسولِ اکرمؐ سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ "جو شخص کوئی صورت بنائے گا اللہ اس پر روزِ قیامت عذاب کرے گا یہاں تک کہ وہ اس میں روح پھونک دے جو اس کے بس سے باہر ہے" یہ کہہ کر آپ نے اس شخص کی طرف رُخ فرمایا جس کا پیشہ ہی یہی تھا۔ اور فرمایا کہ اگر تصویریں ہی بنانا ہیں تو درخت کی تصویر بناؤ یا کسی غیر ذی روح کی شکل بناؤ۔ (الترغیب و الترہیب منذری ۴/۳)

مسند احمد ۱/۲۴۶ میں ابن عباس کی یہ روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جو شخص کوئی صورت بنائے گا اللہ اسے روح پھونکنے کا بھی حکم دے گا جو اس کے امکان میں نہ ہوگا۔ (بیہقی فی السنن ۷/۲۶۸)

صحیح بخاری کتاب اللباس ۴/۲۹ اور موطأ مالک ۲/۱۳۵ میں حضرت عائشہ کی یہ حدیث ہے کہ حضورؐ نے فرمایا "اصحابِ تصویر روزِ قیامت مبتلائے عذاب ہوں گے اور انھیں حکم ہوگا کہ اپنے مخلوقات کو زندہ کریں۔ (سنن بیہقی ۲۶۸)

ان احادیث کی تشریح میں علامہ عینی عمدۃ القاری شرح بخاری ۹/۲۶۸ میں رقم طراز ہیں کہ بعض علماء کے نزدیک تمثال اور تصویر کے ایک ہی معنی ہیں لیکن صحیح یہ ہے کہ صورت صرف جاندار کی تصویر کا نام ہے اور تمثال ذی روح اور غیر ذی روح دونوں کو شامل ہے۔

لیکن یہ بات واضح رہے کہ جس چیز کی تصویر بنائی جا رہی ہے اسے ذی روح اور جاندار ہونا چاہئے تاکہ تصویر بنانے والے پر خالق سے مقابلہ کرنے کا شبہ ہو سکے اور اسے یہ تکلیف دی جا سکے کہ وہ اللہ کی طرح اپنی مخلوق کو ذی روح اور جاندار بنائے اور اسی لئے روایت اوّل میں درخت وغیرہ کی تصویر کو جائز قرار دیا گیا ہے کہ وہ خود ہی جاندار نہیں ہے تو اس کی نقل کرنے والے کو ذی روح بنانے کی تکلیف کیوں کر دی جا سکتی ہے۔

علماء اسلام کے فتاویٰ بھی اس حقیقت کی تائید کرتے ہیں جیسا کہ علامہ عینی

شرح بخاری ۵/ ۵۵۸ میں رقم طراز ہیں کہ لیث بن سعید۔ حسن بن الحی اور بعض شافعی حضرات مطلق تصویر کو مکروہ سمجھتے ہیں۔

نخعی۔ ثوری۔ ابوحنیفہ۔ مالک۔ شافعی اور امام احمد اس تفصیل کے قائل ہیں کہ اگر تصویر پیروں کے نیچے ہے تو کوئی حرج نہیں ہے اور اگر کپڑے یا پردے پر ہے تو حرام ہے۔

الفقہ علی المذاہب الاربعہ ۲/ ۴۸ میں مذکور ہے کہ حیوان کی پوری سایہ دار تصویر بنانا حرام ہے اور غیر حیوان کی مکمل تصویر یا حیوان کی نامکمل تصویر میں کوئی حرج نہیں ہے۔

ان بیانات سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ مجسمہ سازی ہو یا نقاشی یہ دونوں چیزیں اسی وقت حرام ہو سکتی ہیں جب ان کا تعلق ذی روح اور جاندار سے ہو ورنہ غیر ذی روح کی تصویر تو خود حضرت سلیمانؑ کے لئے بنائی جاتی تھی اور آپ اس سے مطمئن تھے جیسا کہ قرآن کریم نے بھی اس واقعہ کو نقل کیا ہے ــــ اور مراسمِ عزا میں کوئی شئے ایسی نہیں ہے جس پر مجسّمہ سازی یا نقشہ کشی کا یہ قانون صادق آسکتا ہو ــــ علم۔ تابوت۔ تعزیہ۔ ضریح میں سے کوئی شئے ایسی نہیں ہے جس کا تعلق کسی جاندار سے ہو بلکہ یہ سب غیر ذی روح کی تصویریں ہیں جن کے بنانے میں کوئی شرعی اشکال نہیں ہے بلکہ ایسی مجسّمہ سازی کی تائید بھی اس روایت سے ہوتی ہے جس کو صحیح بخاری کی پہلی روایت میں نقل کیا جا چکا ہے۔

رہ گیا ذوالجناح تو اس کا مجسمہ سازی میں شمار کرنا ہی ذوقِ فقاہت کے خلاف ہے اس لئے کہ مجسّمہ سازی کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی شئے اپنے ہاتھوں سے تراش خراش کر کسی کی شکل میں بنا دی جائے اور ذوالجناح خالقِ کائنات کی پیدا کی ہوئی مخلوق ہے۔ اس میں بشری تراش خراش کا کوئی دخل نہیں ہے۔ بشر کا کام صرف اس پر مخصوص قسم کا زین وغیرہ ڈال کر اسے فرض و اعتبار کے لحاظ سے ذوالجناح کی شبیہ بنا دینا ہے اور یہ بات کسی قانونِ شریعت کی رو سے حرام

نہیں ہے اور اس کا زندہ ثبوت روزِ عید کا واقعہ ہے جب حضور کائناتؐ اپنے فرزند امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے لئے ناقہ کی شبیہ بنے تھے اور بچوں کو لے کر نمازِ عید کے لئے گھر سے باہر نکلے تھے۔

عالمِ اسلامی مذاق کے اعتبار سے تاریخِ صحابہ سے بھی یہ نظیر پیش کی جا سکتی ہے کہ شبِ ہجرت حضرت ابوبکر حضورِ اکرمؐ کو اپنے دوش پر اٹھا کر غارِ ثور تک لے گئے جو مرکب کی تصویر بننے کی واضح مثال ہے۔

اس نکتہ کو کسی وقت بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ تصویر سازی کا مفہوم ان اعتباری شبیہوں سے بالکل مختلف ہے جہاں صرف ایک ماحول پیدا کر کے کوئی چیز فرض کر لی جاتی ہے اور اس میں بشری تجسیم کا کوئی دخل نہیں ہوتا ہے۔

شبیہ کے جواز کے سلسلے میں تفصیلی بحث آئندہ کی جائے گی۔

ایذاءِ نفس:

مراسمِ عزا کے بعض اقسام کے بارے میں یہ تصوّر بھی کیا جاتا ہے کہ ان پر ایذاءِ نفس کا عنوان صادق آتا ہے اور ایذاءِ نفس شرعی طور پر جائز نہیں ہے — انسان اپنے ہاتھوں سے سینہ کوبی کر کے جلد کو سُرخ و سیاہ کر لے یا اپنے بدن کا قیمتی خون نکال دے یا دہکتے ہوئے انگاروں میں کود جائے تو اس سے زیادہ ایذاءِ نفس کا اور کیا مظاہرہ ہو سکتا ہے۔ عقل کبھی اس بات سے راضی نہیں ہے کہ اپنے نفسِ عزیز کو اس قسم کی ہلاکتوں میں ڈال دیا جائے اور اس کی قدر و قیمت پر توجہ نہ دی جائے۔

اس تصوّر کے تجزیہ کے لئے چند باتوں پر نظر کرنا ضروری ہے۔

۱۔ ایذاءِ نفس کا عنوان حقیقی ہے یا اعتباری؟ — اس سوال کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں دو قسم کی چیزیں پائی جاتی ہیں۔

بعض کا تعلق حقیقت سے ہے اور بعض کا تعلق فرض و اعتبار سے۔

آپ ایک چھپا ہوا کاغذ بازار سے لے آئیے جس پر "سَو روپیہ" لکھا ہو تو اس کاغذ کی دو حیثیتیں ہیں:

ایک حیثیت چھپے ہوئے کاغذ کی ہے جو واقعی اور حقیقی ہے اور ایک حیثیت سو روپیہ کا نوٹ ہونے کی ہے جس کی کُل حقیقت حکومتوں کے اعتبار سے وابستہ ہے کہ حکومت اسے نوٹ کہتی ہے تو نوٹ ہے ورنہ حکومت اپنا اعتبار اٹھالے تو صرف ایک کاغذ کا ٹکڑا ہے اور کچھ نہیں ہے۔

یہی حال تعظیم۔ اہانت۔ انعام۔ ایذا وغیرہ کا بھی ہے کہ ان میں کچھ امور ایسے ہیں جنھیں واقعی تعظیم و اہانت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے اور ان میں کسی قصد اور ارادہ کی ضرورت نہیں ہے اور کچھ امور ایسے ہیں جہاں قصد و ارادہ کی ضرورت پڑتی ہے اور اس کے بغیر نہ اس کا نام تعظیم ہے اور نہ توہین۔ مثال کے طور پر سجدہ کرنا بہر حال تعظیم ہے چاہے انسان تعظیم کا ارادہ نہ بھی کرے لیکن قیام کرنا اسی وقت تعظیم میں شمار ہوتا ہے جب قیام کرنے والا تعظیم کے ارادہ سے قیام کرتا ہے اور لوگ اس ارادہ کو تسلیم کرلیتے ہیں ورنہ ہر قیام تعظیم نہیں ہے اور یہی حال توہین کا بھی ہے کہ طمانچہ مار دینا بہر حال توہین ہے چاہے اس کا ارادہ نہ ہو، لیکن باپ کے سامنے سگریٹ پینا اسی وقت توہین شمار کیا جائے گا جب کوئی معاشرہ اس قسم کے اعتبارات قائم کرلے اور عمل کرنے والا بھی اس اعتبار کی طرف متوجہ ہو ورنہ اس میں کسی طرح کی توہین نہیں ہے۔

تعظیم و اہانت کی طرح ایذار کا عنوان بھی ہے کہ کسی کی مرمّت کر دینا یا اسے گالی دے دینا بہر حال ایذار میں شامل ہے چاہے اس کا ارادہ نہ بھی ہو۔ لیکن مزاح کرنا اس وقت تک ایذار میں شامل نہ ہوگا جب تک وہ مزاح کو اذیت شمار نہ کرتا ہو، اور مزاح کرنے والا بھی اسی ارادہ سے مزاح نہ کرے۔

گویا کہ عنوانِ ایذار میں دو باتوں کا ہونا ضروری ہے۔

عمل ایسا ہو جو طرفِ مقابل کے لئے باعثِ اذیت ہو، اور ارادہ ایسا ہو کہ اسے ایذار پہنچائی جائے ـــــ لہٰذا اگر کوئی شخص کسی عمل میں اذیت محسوس نہیں کرتا ہے تو اس عمل کو ایذار کا نام نہیں دیا جاسکتا ہے۔ لیکن اگر اذیت محسوس کرتا ہے ـــ تو اسے "مزاح المومنین" کہہ کر نہیں ٹالا جاسکتا ہے۔

۲۔ ایذاءِ نفس اور ایذاءِ غیر میں فرق ـــ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ عقلی طور پر ایذاءِ نفس اور ایذاءِ غیر میں بھی فرق پایا جاتا ہے۔

ایذاءِ غیر اس لئے حرام اور غیر صحیح ہے کہ غیر کے نفس پر آپ کو کوئی حقِ تصرف نہیں ہے۔ اس کو ایذا دینا اپنے حدودِ اختیار سے باہر تصرّف کرنے کے مترادف ہے جو کسی قانون میں جائز نہیں ہے۔ لیکن اپنے نفس کا معاملہ اس سے کچھ مختلف ہے۔ اس پر فطرتِ بشر نے انسان کو صاحبِ اقتدار و اختیار بنا دیا ہے۔

اگرچہ یہ قید ضرور رکھی ہے کہ نفس کو تکلیف اسی وقت پہنچائی جا سکتی ہے جب اس کے مقابلہ میں کوئی اس سے بالاتر مفاد پیشِ نظر ہو۔ اس سے کون سا صاحبِ عقل و انصاف انکار کر سکتا ہے کہ بڑے مفاد کے لئے چھوٹی قربانی مقتضائے عقل اور تقاضائے فطرت ہے۔ دنیا میں کون سا انسان ہے جو زحمت اٹھائے بغیر کسی مفاد تک پہنچ جاتا ہے اور مصائب کا مقابلہ کئے بغیر بڑے مقصد کو حاصل کر لیتا ہے۔

آج کا انسان چھوٹے چھوٹے فوائد کے لئے بھی بڑی بڑی زحمتیں برداشت کرتا ہے۔ تجارت کی دنیا ہو یا سیاست کا میدان، اجتماعی خدمت ہو یا اقتصادی جدّوجہد۔ کوئی میدانِ عمل ایسا نہیں ہے جہاں زحمات اور شدائد کا مقابلہ نہ ہو ـــ اور انسان یہ سب کچھ اس لئے برداشت کرتا ہے کہ اس طرح تجارت میں فروغ ہوگا، سیاست کامیاب ہوگی۔ سماج کا سدھار ہوگا اور معاشی حالات بہتری سے قریب تر ہوں گے۔

ایسے حالات میں یہ فیصلہ انتہائی غلط ہے کہ ایذاءِ نفس غیر عقلی اقدام ہے اور اسے عقلی طور پر مذموم ہونا چاہئے ـــ اس اقدام پر عقلاءِ عالم کا اتفاق ہے اور اسے ہر صاحبِ عقل و شعور استحسان کی نظر سے دیکھتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس سلسلے میں یہ بات تشنہ بیان رہ جائے گی کہ وہ کون سے مفادات ہیں جن کی خاطر نفس کو مشقتوں میں ڈالا جا سکتا ہے؟

مادی دنیا تجارتی فوائد اور سیاسی مصالح کو مفاد تصوّر کرتی ہے اور اس سے بالاتر مقاصد کو فائدہ تصور نہیں کرتی ہے لیکن مذہبی دنیا کے افکار اس سے مختلف ہیں یہاں

احسان شناسی اور بزرگوں کی یاد کو تازہ رکھنا بھی ایک اہم مفاد ہے۔ قوموں کی زندگی کے اسباب فراہم کرنا اور ان کے حوصلوں کو بلند رکھنا بھی ایک مصلحت ہے —
اس لئے یہاں ان یادوں کو زندہ رکھنے کے لئے، ان حوصلوں کو تازہ کرنے کے لئے نفس کو مشقت میں ڈالنا ایک قابلِ استحسان عمل ہوگا جس کی کسی طرح بھی مذمت نہیں کی جاسکتی ہے۔

۲۔ ایذاء نفس کی شرعی حیثیت — کہا جاتا ہے کہ شرعی اعتبار سے اپنے نفس کو اذیت دینا ایک طرح کی ہلاکت کے مترادف ہے۔ لہٰذا بنصِ آیتِ شریفہ "وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ" حرام ہے۔

لیکن کھلی ہوئی بات ہے کہ یہ استدلال ایک خطابت اور شاعری سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا ہے۔ ہلاکت اور ہے اور ایک طرح کی ہلاکت اور ہے۔
قرآن مجید نے ہلاکت کے اقدام کو حرام قرار دیا ہے۔ اذیت کے اقدام کو نہیں۔!
ماتمِ حسینؑ، جذبۂ شہادت و قربانی کا اظہار ہے۔ فی الحال قربانی نہیں ہے۔ اس کے بارے میں بعض علماء کرام نے بہت حسین بات کہی ہے کہ اسلام ہم سے ہر دور میں الگ الگ تقاضے رکھتا ہے اور ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اس کے ہر تقاضے پر لبیک کہیں۔

دورِ غیبت میں ہم سے آنسوؤں کا مطالبہ ہے لہٰذا ہمارا فرض ہے کہ ہم غمِ مظلومین میں اشک افشانی کریں اور ظہورِ امامؑ کے بعد ہم سے خون کا تقاضا ہوگا تو ہمارا فرض ہوگا کہ ہم اپنے خون کو زیادہ سے زیادہ کل کے لئے محفوظ رکھیں — یہ اور بات ہے کہ حوصلوں کو زندہ رکھنے کے لئے وقتاً فوقتاً ایسے جذبات کا بھی مظاہرہ ہوتا رہے تاکہ ہمتیں پست نہ ہونے پائیں اور حوصلوں پر زوال نہ آنے پائے۔

رہ گیا آیتِ شریفہ کا مسئلہ — تو اس سے استدلال خلافِ شانِ فقاہت ہے۔ کہ اوّلاً تو آیت مقامِ انفاق میں وارد ہوئی ہے اور اس کی تمہید میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ "راہِ خدا میں انفاق کرو اور اپنے نفس کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔"

یعنی راہِ خدا میں انفاق ترک کرکے بخل کے ذریعہ اپنے کو ہلاکت اخروی میں نہ ڈالو یا حد سے زیادہ انفاق کرکے اپنے کو ہلاکتِ دنیا میں نہ ڈالو۔ اور یہ دونوں باتیں محلِ بحث سے خارج ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر یہ جملہ مستقل حیثیت رکھتا ہے تو اس میں ہلاکت سے روکا گیا ہے اور ہلاکت کی دو قسمیں ہیں:

ہلاکتِ دنیوی اور ہلاکتِ اخروی۔

ہلاکتِ دنیوی سے مراد تباہی اور بربادی ہے۔ اور ہلاکتِ اخروی سے مراد عذابِ الٰہی ہے اور اس بنا پر کبھی جان کو خطرہ میں ڈال دینا ہلاکت ہوجاتا ہے اور کبھی خطرہ سے بچ جانا بھی ہلاکت ہوجاتا ہے۔ مثال کے طور پر عام حالات میں موت کی طرف بڑھنا ہلاکت ہے اور جہاد کے حالات میں میدانِ جنگ سے قدم پیچھے ہٹا لینا ہی ہلاکت ہے۔

پہلی قسم کا نام ہلاکتِ دنیا ہے اور دوسری قسم کا نام ہلاکتِ آخرت ہے۔

ائمہ معصومینؑ کا دیدہ و دانستہ موت کی طرف قدم آگے بڑھانا اور زہر آلود انگور وغیرہ کا کھا لینا اسی ہلاکتِ آخرت سے تحفّظ کا نتیجہ تھا کہ یہ حضرات دنیا پر واضح کردینا چاہتے تھے کہ بعض حالات میں موت کی طرف قدم آگے نہ بڑھانا ہی ہلاکت ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کا کوئی تعلق دنیا سے نہیں ہے بلکہ یہ آخرت کی ہلاکت ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کا صحیح احساس تمھیں نہیں ہے جیسا کہ خود قرآن مجید نے اعلان کیا ہے کہ "راہِ خدا کے مرنے والے زندہ ہیں لیکن تمھیں ان کی زندگی کا شعور بھی نہیں ہے۔" جس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ تمھاری نظر میں ہلاکت، دنیا تک محدود ہے۔ اس لئے تم انھیں مُردہ سمجھ رہے ہو اور ہماری نظر میں ہلاکت آخرت بھی ہلاکت ہے جس سے ان لوگوں نے نجات حاصل کرلی ہے لہٰذا ہم نے اس کا نام حقیقی زندگی اور جاودانی حیات رکھا ہے اور انھیں مُردہ نہیں کہا جاسکتا ہے۔

حیرت اُن افراد پر ہے جو اس مسئلہ پر بحث کرتے ہیں کہ جناب امیرؑ نے ابن ملجم

کو بیدار کیوں کیا ــــ امام حسنؑ نے جام زہر کیوں پیا ــــ ائمہ معصومینؑ نے دیدہ ودانستہ موت کی طرف قدم آگے کیوں بڑھایا ــــ؟ اور یہ نہیں سوچتے ہیں کہ اسلام نے جہاد کا حکم کیوں دیا ہے اور مجاہدین کو موت کے میدان میں کیوں بھیج دیا ہے ــــ؟

اگر اس منزل پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ بقائے دین اور تحفظِ مذہب کے لئے قربانی دی جاسکتی ہے اور یہ قربانی ہلاکت نہیں ہے تو ائمہ معصومینؑ کے کردار کے بارے میں بھی یہی کہا جائے گا کہ ایسے حالات میں ان حضرات کا قربانی پیش کر دینا ہی ظلم کو بے نقاب کرنے کے لئے انتہائی ضروری تھا ــــ اور ظلم کا بے نقاب کرنا بعض حالات میں اتنا ہی اہم ہوتا ہے جتنا اہم فریضہ میدانِ جنگ میں شہید ہو جانا ہوتا ہے۔ اسلام کو خطرہ کبھی خارجی دشمن سے ہوتا ہے اور کبھی داخلی دشمن کی قیادت سے ہوتا ہے۔

پہلے میدان میں عام مجاہدین کی ضرورت ہوتی ہے جو جان کی بازی لگا کر خارجی دشمن سے مقابلہ کرتے ہیں اور مذہب کو تباہی سے بچا لیتے ہیں اور دوسرے میدان میں معصوم رہنماؤں کی ضرورت ہوتی ہے جو اپنی قربانی پیش کر کے دنیا پر یہ واضح کر دیتے ہیں کہ جو معصوم افراد کی زندگی کا دشمن ہو اور جو بے گناہوں کے خون بہانے میں تکلّف نہ کرتا ہو اسے دین کی قیادت نہیں سپرد کی جاسکتی ہے۔

یہ اور بات ہے کہ جس طرح باطل کی سرکشی ایک مُدّت تک برداشت کرنے کے بعد میدانِ جہاد گرم ہوتا ہے اسی طرح باطل کی سازشوں کو ایک زمانے تک برداشت کرنے کے بعد ہی اس کے بے نقاب کرنے کا وقت آتا ہے۔

واضح لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ خالقِ کائنات نے اپنی مشیّت خاص سے یہ طے کر دیا ہے کہ جب اپنے معصوم بندوں کو دنیا سے اٹھائے گا تو ان کے کردار کی عظمت کو محفوظ رکھنے اور ان کی موت کو زندگی کی طرح مذہب کے لئے مفید اور کارآمد بنانے کے لئے ایسے وسائل اختیار کرے گا جہاں موت بھی مذہب کے اہم مسائل کے حل کرنے کا وسیلہ بن جائے۔

آیت شریفہ میں جس ہلاکت سے روکا گیا ہے اس سے مُراد صرف ہلاکتِ دنیا ہی

نہیں ہے بلکہ وہ ہلاکتِ آخرت بھی ہے جس سے بچنا کبھی کبھی ہلاکتِ دنیا پر موقوف ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ہر حالت میں ہلاکتِ دنیا مذموم نہیں قرار پا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ ایذاءِ نفس کسی لغت و زبان میں مترادف نہیں ہے اور نہ اسے ہلاکت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ہلاکت مطلق طور پر مذموم و ممنوع ہو جائے تو بھی ایذاءِ نفس کو مذموم نہیں قرار دیا جا سکتا ہے اور محلِ بحث ایذاءِ نفس ہے ہلاکت نہیں ہے۔

مذکورہ بالا حقائق سے یہ نتیجہ واضح ہو جاتا ہے کہ زیرِ بحث مراسم کسی اعتبار سے بھی شرعی اشکال کے حامل نہیں ہیں۔

اور نہ ان کا شمار بدعتوں میں ہے کہ بدعت کے لئے شرعی معیار زمانِ پیغمبرؐ نہیں ہے بلکہ زبانِ پیغمبرؐ ہے کہ جس شئے کو حضورؐ کی زبانِ وحی ترجمان نے مباح نہیں قرار دیا ہے وہ حرام ہے اور جو حضورؐ کے مباحات کے دائرہ کے اندر ہے اس کے حرام ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اور جہاں تک سرکار دو عالمؐ اور اربابِ عصمت کے دائرۂ بیان کا تعلق ہے اس کے واضح اعلان کی بنا پر کہ ہر شئے حلال کہی جائے گی جب تک اسے حرام نہ کہہ دیا جائے۔ اپنی طرف سے کسی چیز کے حرام قرار دینے کا کوئی جواز نہیں ہے اور یہ کام خود بھی حرام ہے جیسا کہ خلیفۂ دوم عمر بن الخطاب نے صاف لفظوں میں اعلان کر دیا تھا کہ "دو متعہ زمانۂ پیغمبرؐ میں حلال تھے اور میں انھیں حرام کئے دیتا ہوں" — گویا حلال و حرام پیغمبرؐ کی کوئی حیثیت نہیں ہے اور آخرت تو بھی اسے تبدیل کر دینے کا حق حاصل ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ بدعت کے نام پر وہ چیزیں حرام بنائی جاتی ہیں جن کا وجود حضورِ انورؐ کے دور میں نہیں تھا اور یہاں تو خود ہی اعلان ہو رہا ہے کہ دونوں متعہ حضورؐ کے دور میں تھے تو اب انھیں حرام قرار دینے کا جواز کہاں سے پیدا ہو گیا ہے۔

بدعت کے بارے میں یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ بدعت لغوی اعتبار سے "نئی چیز" کو کہا جاتا ہے اور کسی چیز کے نئے یا پرانے ہونے کا فیصلہ بھی دوسری چیزوں کے لحاظ و اعتبار ہی سے کیا جائے گا کہ ایک شئے ایک آدمی کے اعتبار سے نئی ہوگی اور

دوسرے کے اعتبار سے پرانی ہوگی۔

دس سال پرانی چیز ہمارے اعتبار سے پرانی ہے اور صد سالہ بزرگ کے اعتبار سے نئی ہے ـــــ لہٰذا کسی شئے کو بدعت کہنے سے پہلے یہ طے کرنا ہوگا کہ اس جدّت کا حساب کس کے اعتبار سے کیا جائے گا۔

عوام اُمّت کا خیال ہے کہ جدّت کا معیار زمانۂ پیغمبرؐ ہے اور صاحبانِ تحقیق کا مسلک ہے کہ اس کا معیار زبانِ پیغمبرؐ ہے۔

اسلام کا ظرفِ زمان دورِ پیغمبرِ اعظمؐ سے صبحِ قیامت تک ہے۔ اسے ۱۱ھ کے قبل و بعد سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

مجسّمہ سازی کے اعتبار سے بھی مراسمِ عزا کو حرام نہیں کہا جا سکتا ہے کہ اسلام نے جس مجسّمہ سازی کی مخالفت کی ہے وہ ذی روح کا مجسّمہ ہے جس کی نقل کرنے میں خالق سے مقابلہ کا توہّم پیدا ہو سکتا ہے اور روزِ قیامت روح پھونکنے کا حکم دیا جا سکتا ہے ـــــ لیکن مراسمِ عزا میں کسی خدائی تخلیق کی مشابہت یا اس کا مقابلہ نہیں ہے بلکہ یہ سب انسانی صنعت کی نقلیں ہیں جن میں قدرتِ خدا سے مقابلہ کا کوئی تصوّر نہیں پیدا ہو سکتا ہے۔ یہاں کا تابوت و تعزیہ قبرِ مبارک کی شبیہ ہے۔

یہاں کی ضریح ـــــ ضریحِ اقدس کی نقل ہے۔

یہاں کی عماری ـــــ محمل کی شبیہ ہے۔

یہاں کا عَلم ـــــ عَلم کی شبیہ ہے۔ اور قبر و ضریح و عَلم میں کوئی شئے ایسی نہیں ہے جو انسانی صنعت سے باہر ہو اور جس کی نقل بنانے میں ربّ العالمین سے مقابلہ کرنے کا توہّم پیدا ہو سکتا ہو ورنہ اگر اس توہّم کا امکان پیدا ہو گیا تو اصل قبر کا بنانا بھی حرام ہو جائے گا ـــــ اور نہ کسی مرنے والے کی قبر بنے گی اور نہ کسی قبر پر ضریح بنائی جائے گی۔ نہ کوئی عَلم تیار ہوگا۔ نہ کوئی پرچم لہرائے گا ـــــ اور اگر یہ رسم نکل آئی تو مُردے بلا قبر کے رہ جائیں گے۔ قبرِ پیغمبرؐ کی ضریح اُٹھ جائے گی۔ لشکرِ اسلام بلا پرچم رہ جائے گا اور دنیا میں کوئی شئے مجسّمہ سازی کے جُرم سے باہر نہ آ سکے گی۔

رہ گیا ذو الجناح ـــ تو اس کے بارے میں وضاحت کی جا چکی ہے کہ ذوالجناح انسانی صنعت نہیں ہے بلکہ وہ خدا کا پیدا کیا ہوا ایک حیوان ہے جسے انسان نے مخصوص قسم کی چادر وغیرہ اوڑھا کر اسے ایک خاص حیوان کی شبیہ بنا دیا ہے جو کربلا میں سرکار سیّد الشہدائؑ کے ساتھ وفا کا مظاہرہ کر رہا تھا اور اتنی سی تشبیہ شریعت کے اعتبار سے قطعاً حرام نہیں ہے۔

ایذاءِ نفس کے اعتبار سے بھی مراسمِ عزا میں کوئی وجہ حرمت نہیں ہے کہ حکمِ حرمت صرف اس اذیت پر لگایا جا سکتا ہے جو ہلاکت کی حد تک پہنچ جائے اور یہاں ہلاکت کا کوئی امکان نہیں ہے ـــ ہلاکت سے کمتر حدود میں اذیت و مشقت برداشت کرنا خود سرکارِ دوعالمؐ کا کردار رہا ہے جس کے بارے میں خود رب العالمین نے اشارہ کیا ہے "طٰهٰ مَآ اَنزَلنَا عَلَيكَ القُرآنَ لِتَشقٰی"۔ "يَآاَيُّهَا المُزَّمِّلُ قُمِ الَّيلَ اِلَّا قَلِيلًا" مقصد یہ ہے کہ زیادہ مشقتیں نہ برداشت کیا کرو۔ زیادہ مصائب نہ اٹھاؤ اور ذرا آرام بھی کر لیا کرو۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ اگر ساری مشقتیں برداشت کرنا حرام ہوتا تو حضورؐ کبھی ایسا اقدام نہ کرتے کہ معصومؑ کی زندگی میں کسی ناجائز عمل کا کوئی امکان نہیں ہے۔

ہم زندۂ جاوید کا ماتم نہیں کرتے:

مذکورہ بالا شبہات کے علاوہ ایک جدید شبہ یہ بھی پیدا ہو گیا ہے کہ شہداءِ راہِ خدا زندۂ جاوید ہیں اور زندۂ جاوید کا ماتم جائز نہیں ہے۔

عوامی دنیا میں اس فلسفہ کو سابق کے جملہ اعتراضات و شبہات سے زیادہ اہمیت حاصل ہے لیکن مجھے اس مقام پر دو ہی باتیں عرض کرنا ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ یہ کلام کسی معصوم نبی یا امام کا کلام نہیں ہے لہٰذا اس کلام میں "ہم" کی کوئی قیمت نہیں ہے ـــ ایک غیر معصوم انسان ماتم کرتا ہے تو یہ اس کے جواز کی دلیل نہیں ہے اور اگر ماتم سے گریز کرتا ہے تو یہ اس کے حرام ہونے کی دلیل نہیں ہے

دوسری بات یہ ہے کہ اس استدلال کی ساری بنیاد ہے زندگانی جاوداں پر ـــ اور

شاعر کا مطلب یہ ہے کہ جو زندۂ جاوید ہوتا ہے اس کا ماتم نہیں ہو سکتا ہے۔ اس استدلال کے تین جزء ہیں۔ پہلا جزء یہ ہے کہ شہید زندۂ جاوید ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ خود قرآن مجید نے واضح لفظوں میں اعلان کر دیا ہے کہ "راہِ خدا کے شہیدوں کو مُردہ نہ سمجھنا۔ یہ زندہ ہیں اور اپنے پروردگار کی بارگاہ سے رزق پا رہے ہیں"۔ لیکن یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ یہ زندگی عام زندگی سے مختلف ہے۔ اس کی حیثیت مادّی زندگی کی نہیں ہے ورنہ اگر یہ مادّی اعتبار سے بھی زندہ ہوتے تو نہ ان کی زوجہ کو عقدِ ثانی کا اختیار ہوتا اور نہ ان کی اولاد ترکہ کی وارث ہوتی ــــ بلکہ ان کا کفن و دفن بھی نہ ہوتا جس کا زبان سے نکالنا بھی کسی مردِ فقیہ یا مردِ مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے

دوسرا جزء یہ ہے کہ زندہ کا ماتم نہیں ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ بات صریح آیتِ قرآن کے خلاف ہے۔ جہاں جنابِ یعقوبؑ کے فراقِ یوسفؑ میں رونے کا ذکر کیا گیا ہے کہ آنکھیں سفید ہو گئیں اور اولاد نے انھیں گمراہ کہنا شروع کر دیا۔

ظاہر ہے کہ جناب یعقوبؑ کو یوسفؑ کی حیات کا مکمل علم تھا اور انھوں نے اولاد پر ان کے مکر کو واضح بھی کر دیا تھا لیکن اس کے باوجود مسلسل گریہ فرما رہے تھے جو اس بات کا زندہ ثبوت ہے کہ زندگانیِ جاوید تو درکنار، مادّی زندگی میں بھی فراق پر رونا جائز ہے اور جب فراق پر ماتم کرنا مباح ہے تو سارے گھر کے اُجڑ جانے پر ماتم کیوں نہیں ہو سکتا ہے۔

تیسرا جزء یہ ہے کہ ماتم صرف موت پر ہوا کرتا ہے۔ یہ بھی صریح قرآن کے خلاف ہے اور سیرتِ مسلمین کے بھی خلاف ہے اور اسے عقل بھی قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہے گویا کہ جو موت کے بعد مُردہ ہو جائے، ہلاک ہو جائے، حیاتِ ابدی سے محروم ہو جائے۔ اس کے مصائب پر ماتم کیا جا سکتا ہے اور جسے رب العالمین کی طرف سے حیاتِ ابدی مل جائے وہ کسی ماتم کا مستحق نہیں ہے۔ کیا دنیا کا کوئی عاقل انسان اس تصوّر کو تسلیم کر سکتا ہے؟

تاریخِ اسلام تو یہاں تک بیان کرتی ہے کہ حضورِ اکرمؐ کے وصال کے موقع پر مسلمان

چیخ مار مار کر رو رہے تھے ـــــ بعض اصحاب منہ پیٹ رہے تھے اور بعض کا تو "شدت غم" سے یہ عالم تھا کہ انھیں حضورؐ کے انتقال کا یقین ہی نہیں آرہا تھا اور وہ اس خبر کے نشر کرنے والوں کو تلوار سے دو نیم کرنے پر آمادہ تھے تو کیا کثرت گریہ وزاری اور بدحواسی وبیہوشی اس بات کی دلیل ہے کہ معاذ اللہ مسلمان حضورؐ کو "ہلاک ابدی" سمجھتے تھے اور حضورؐ کی حیاتِ جاودانی کے قائل نہیں تھے ـــــ؟ اگر ایسا تھا تو تلوار نکالنے کی ضرورت ہی کیا تھی ؟

مسلمانوں کے کردار سے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک طرف وفات کے منکر تھے اور دوسری طرف مصروفِ گریہ وبکا تھے جو اس بات کا زندہ ثبوت ہے کہ تاریخ میں گریہ زندگی ہی پر ہوا ہے موت پر نہیں ہوا ہے۔ اب جو لوگ زندگی میں گریہ کے مخالف ہیں انھیں ان اصحاب سے سخت باز پرس کرنی چاہیئے اور ان کے کردار کا باقاعدہ محاسبہ کرنا چاہیئے۔

ان بیانات سے صاف واضح ہوتا ہے کہ رسول اکرمؐ کے بنیادی قانون "ہر شئے مباح ہے جب تک اس کے بارے میں کوئی ممانعت ثابت نہ ہو جائے" اور عقل کے مسلم اصول "حکم کو بیان کئے بغیر عقاب کرنا خلافِ قانون ومنطق ہے" کے خلاف جتنے شبہات وتخیلات پیش کئے جاتے ہیں وہ سب بے بنیاد اور بے اصل ہیں اور ان سے مراسم عزاء پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے۔

مراسم عزاء تمام خصوصی دلائل وبراہین سے قطع نظر بھی جائز ہیں اور ان کی حرمت کی کوئی شرعی دلیل نہیں ہے ـــــ چہ جائیکہ کتب احادیث وتاریخ میں ہر ہر رسم عزاء کے جواز پر متعدد دلائل موجود ہیں جن کی تفصیل آئندہ پورے شرح وبسط کے ساتھ بیان کی جائے گی۔

یہ بات ضرور یاد رکھنی چاہیئے کہ موضوعِ سخن رسوم عزاء کا اصل جواز نہیں ہے بلکہ ان کے شرعی حدود ہیں لہٰذا جواز کے دلائل کے ساتھ ان کے حدود کی طرف بھی اشارہ کرنا ضروری ہے تاکہ بات مکمل ہو جائے اور موضوعِ سخن سے باہر نہ جانے پائے۔

گریہ :

گریہ کے تین درجات ہیں: بکاء۔ ابکاء۔ تباکی ـــــ رونا۔ رُلانا۔ غمزدہ شکل اختیار کرنا۔

بکاء کے بارے میں تاریخ اور حدیث کی کتابوں میں حسب ذیل دلائل پائے جاتے ہیں:

* انس راوی ہیں کہ اپنے فرزند ابراہیم کے وقتِ آخر رسولِ اکرمؐ نے رونا شروع کیا تو عبدالرحمٰن بن عوف نے کہا ـــــ حضورؐ آپ رو رہے ہیں؟

فرمایا یہ علامتِ رحمت ہے۔ آنکھیں بہرحال اشکبار ہوں گی۔ دل بہرصورت محزون ہوگا۔ یہ اور بات ہے کہ ہم مرضیِ خدا کے خلاف کوئی کلمہ زبان پر جاری نہیں کرتے ہیں۔ (مشکوٰۃ المصابیح باب البکاء علی المیت)

اس روایت سے مرنے والے پر گریہ کے جواز کے ساتھ ساتھ یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ زندگی کی حالت میں بھی گریہ کرنا جائز ہے جس کی دلیل مرسلِ اعظمؐ کے یہ فقرات ہیں "اَنَا بِفِرَاقِكَ يَا اِبْرَاهِيمُ لَمَحْزُوْنُوْنَ" اس حزن کا تعلق ابراہیم کے فراق سے ہے اور فراق پر گریہ کرنا جائز ہے چاہے وہ فراق موت کی بنا پر ہو یا حیاتِ جاودانی کی بنیاد پر۔

* جناب حمزہؑ کی شہادت پر حضورِ اکرمؐ نے اظہارِ حسرت فرمایا "اَمَّا عَمِّيْ حَمْزَةُ فَلَا بَوَاكِيَ لَهٗ" افسوس ـــــ کہ میرے چچا حمزہ پر رونے والیاں نہیں ہیں۔

حسرتِ پیغمبرؐ ایک واضح دلیل ہے کہ گریہ مذموم نہیں ہے بلکہ ایسا ممدوح عمل ہے جس کے نہ ہونے کا صدمہ حضورِ انورؐ کو ہے۔

* جناب جعفر کی شہادت کے موقع پر حضورؐ نے مسجد میں اصحاب کو خبرِ شہادت سنائی اور اس قدر روئے کہ ہچکیاں بندھ گئیں اور اس کے بعد فرمایا "عَلٰى مِثْلِ جَعْفَرٍ فَلْيَبْكِ الْبَوَاكِيْ" جعفر جیسے انسان پر گریہ ہونا چاہئے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ فضائل و کمالات، غربت و مسافرت اور شہادت و مصیبت کسی اعتبار سے بھی

امام حسینؑ، حضرت جعفرؑ سے کم نہیں ہیں۔ لہٰذا اس روایت کی بنیاد پر حسینؑ کے مصائب پر گریہ کرنا حکم پیغمبرؐ کے حدود میں شامل ہے اور اسے بدعت نہیں کہا جا سکتا ہے۔

★ جناب اُمّ سلمہ اور جناب ابن عباس راوی ہیں کہ عاشور کے دن حضور سرورِ کائناتؐ عالمِ خواب میں تشریف لائے اور اس وقت غمِ حسینؑ میں محزون و اشکبار تھے۔

(ترمذی۔ مسند احمد)

★ اُمّ الفضل بیان کرتی ہیں کہ ایک مرتبہ حسینؑ رسولِ اکرمؐ کی آغوش میں تھے اور آپ آنسو بہا رہے تھے تو میں نے گھبرا کر پوچھا کہ حضورؐ اس کا سبب کیا ہے تو آپ نے فرمایا کہ ابھی جبرئیل امینؑ اس کی شہادت کی خبر دے گئے ہیں اور انھوں نے مقتلِ حسینؑ کی سُرخ مٹی بھی دی ہے۔ (مشکوٰۃ المصابیح)

★ ابو ہریرہ راوی ہیں کہ آلِ رسولؐ میں کسی فرد کا انتقال ہو گیا تو عورتوں نے رونا شروع کیا۔ عمر نے اٹھ کر انھیں جھڑک دیا تو حضرتؐ نے فرمایا کہ اے عمر انھیں چھوڑ دو آنکھیں اشکبار رہیں گی اس لئے کہ دل غمزدہ ہے اور مصیبت بھی تازہ ہے۔ (مشکوٰۃ المصابیح)

★ جنگ صفین سے واپسی پر جب امیر المومنینؑ کا گذر کربلا کی طرف سے ہوا تو آپ نے گریہ فرمایا اور امام حسینؑ کو صبر کی وصیت فرمائی۔ (بحار ۱۰/۱۶۱)

★ امام حسنؑ کا وقتِ آخر تھا اور امام حسینؑ نے بھائی کے جگر کے ٹکڑوں کو دیکھ کر رونا شروع کیا تو امام حسنؑ نے کربلا کا ذکر کر کے گریہ فرمایا۔

★ صدیقہ طاہرہ فاطمہ زہراؑ اپنے فرزند امام حسینؑ کی ولادت کے موقع پر باپ سے خبرِ شہادت سُن کر روئیں۔

★ خود امام حسینؑ نے اپنے مصائب پر یہ کہہ کر گریہ فرمایا "اَنَا قَتِيْلُ الْعَبْرَةِ" میں کشتۂ گریہ ہوں۔

★ امام زین العابدینؑ کربلا کے حادثہ کے بعد تا حیات روتے رہے۔

★ امام محمد باقرؑ نے ۸۰۰ درہم کی وصیت فرمائی کہ اسے مقامِ منیٰ میں گریہ و ماتم کرنے والوں پر صرف کیا جائے۔ (تہذیب۔ منتہیٰ۔ من لایحضرہ الفقیہ)

* امام جعفر صادقؑ نے ابو بصیر سے فرمایا کہ بلند آواز سے رویا کرو۔
* امام موسیٰ کاظمؑ نے مختلف مواقع پر مجلس عزا کا اہتمام کیا۔
* امام رضاؑ نے ابن شبیب سے فرمایا کہ جب تمھیں کسی چیز پر رونا آئے تو میرے جدِ مظلوم حسینؑ پر رونا کہ انھیں گوسفند قربانی کی طرح ذبح کیا گیا ہے۔
* امام محمد تقیؑ۔ امام علی نقیؑ۔ امام حسن عسکریؑ نے بھی مختلف اوقات میں گریہ و زاری کا اہتمام فرمایا ہے۔
* امام عصرؑ کا بیان ہے کہ اے جدِ بزرگوار ـــــ! اگر میں کربلا میں نہیں تھا تو اب آپ کے مصائب پر خون کے آنسو بہاؤں گا۔

مذکورہ بالا روایات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ تاریخ و حدیث کے اسناد کے مطابق گریہ ہر دَور میں مستحسن رہا ہے اور امام حسینؑ کی ولادت کے موقع سے لے کر آج تک جملہ اربابِ عصمت نے آپ کے مصائب پر گریہ فرمایا ہے بلکہ شیعی روایات کی بنا پر تو دَورِ جناب آدمؑ سے مختلف انبیاءِ کرام کے دَور میں گریہ کا تذکرہ ملتا ہے اور اس کے بعد سنّتِ انبیاء کو بدعت سے تعبیر کرنا ایک کفر آمیز عمل ہو جاتا ہے۔

اس مقام پر صرف ایک روایت حضرت ابن عمر کی ملتی ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رونے سے مرنے والے پر عذاب ہوتا ہے جس کی تردید خود امّ المومنین عائشہ نے نہایت ہی حسین انداز سے کردی تھی کہ ابن عمر جھوٹ تو نہیں بولے ہیں لیکن ان سے نسیان یا خطا کا صدور ضرور ہوا ہے۔

یہ روایت ایک یہودی عورت کے مرنے کے بارے میں ہے جہاں حضورؐ نے یہ فرمایا تھا کہ "لوگ اس پر گریہ کر رہے ہیں اور قبر میں اس پر عذاب ہو رہا ہے۔

اور عبد اللہ بن ابی ملیکہ کی روایت کی بنا پر" اس روایت کی تردید کے لئے آیتِ قرآن ہی کافی ہے جہاں یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ ہر آدمی اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے اور کسی کا بوجھ دوسرے کے سر پر نہیں لادا جائے گا۔

ایسے حالات میں یہ تصوّر کرنا کہ گریہ کرنے کی وجہ سے میّت پر عذاب ہوتا ہے

عدالتِ الٰہیہ کے منافی اور نظامِ اسلام کے خلاف ہے۔ بالخصوص امام حسینؑ جیسی عظیم شخصیتوں پر گریہ کرنا جو گناہوں کے محو ہو جانے کا بہترین وسیلہ اور مختلف معصومینؑ کی شفاعت کا ذریعہ ہے۔

ابکاء:

مذکورہ بالا روایات سے رونے کے ساتھ رُلانے کا جواز بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ حضرت حمزہؓ و جعفرؓ کی شہادت پر مرسلِ اعظمؐ نے صرف خود گریہ نہیں فرمایا بلکہ مجمعِ اصحاب میں تذکرہ فرما کر گریہ کرنے کی دعوت بھی دی ہے اور اس عمل کو خود امام حسینؑ کی خبرِ شہادت پر بھی انجام دیا ہے اور کبھی اُمّ سلمہ سے بیان کیا ہے اور کبھی عائشہ سے بیان کیا ہے کبھی مجمعِ اصحاب میں ذکر فرمایا ہے اور کبھی بزمِ اہلبیتؑ میں ___ جو عمل گریہ کے شدّت سے محبوب ہونے کی علامت ہے۔

پھر یہ بھی یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ رُلانے کا ردِّ عمل رونے سے قدرے مختلف ہے۔ رونا ایک فطری ردِّ عمل ہے کہ جب بھی انسان کسی واقعہ سے متاثر ہو جاتا ہے اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آتے ہیں لیکن رُلانا اپنے اختیار کی بات نہیں ہے۔ اس کا تعلق دوسرے کے نفسیاتی ردعمل سے ہے اس لئے اس کے دائرہ میں وہ تمام اعمال آجائیں گے جن سے رُلانے کا عمل انجام دیا جا سکے۔ چاہے وہ اظہارِ حسرت و غم ہو جیسا کہ حضرت حمزہؓ کی شہادت پر ہوا ___ یا شدّتِ گریہ ہو جیسا کہ حضرت جعفرؓ کی خبرِ شہادت پر ہوا ___ یا خاکِ مقتل کا دکھلانا ہو جیسا کہ جبرئیل امینؑ نے کیا ہے۔

اس بنیاد پر رُلانے کے جواز و استحباب سے ان تمام شرعی امور کے جواز و استحباب پر استدلال کیا جا سکتا ہے جو گریہ کا ماحول پیدا کرنے کے لئے مفید اور رُلانے کے لئے معین و مددگار ہوں۔

تباکی:

رونے والوں کا انداز اختیار کرنے اور غم زدہ کی شکل بنانے کے بارے میں

ایک عام تصوّر یہ پایا جاتا ہے کہ یہ ایک طرح کی ریاکاری ہے جو کسی قانون میں مستحسن نہیں ہو سکتی ہے اور نہ اسے فطرتِ غم ہی برداشت کر سکتی ہے۔ فطرتِ غم خلوص اور تاثر چاہتی ہے۔ اسے ریاکاری اور نمائش سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔

لیکن یہ تصوّر انسانی نفسیات سے غفلت کا نتیجہ ہے۔

فطرت کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ آنسو انسان کی پلکوں کی پیداوار نہیں ہیں کہ ایک ہلکے سے اشارہ سے اشکوں کا سیلاب رواں ہو جائے اس کے لئے شدّتِ تاثر اور سازگاریِ فضا کی ضرورت ہوتی ہے۔

اکثر اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان حالات سے بے حد متاثر ہوتا ہے۔ اس کا دل شدّتِ غم سے بھرا ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود آنکھوں سے آنسو نہیں نکلتے ہیں اس وقت انسان کا چہرہ اس کے تاثر کا پتہ دیتا ہے اگرچہ آنسو غم کی حکایت کے لئے ساتھ نہیں دیتے ہیں۔ اسی اندازِ تاثر کا نام "تباکی" ہے جو رونے والوں کی صورت بنانے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ تباکی کا مقصد یہ ہے کہ اگر آنسو انسان کی ہمراہی نہ کر سکیں تو کم از کم اتنا قلبی تاثر ضرور رہے کہ حالات کو دیکھ کر اندازہ کر لیا جائے۔

بلند آواز سے رونا بھی تباکی ہی کی ایک قسم ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ دل شدّت سے رونے پر آمادہ ہے لیکن آنسو ہمراہی نہیں کر رہے ہیں۔ اس لئے اظہارِ غم کا یہ وسیلہ اختیار کیا جا رہا ہے۔

مرسلِ اعظمؐ کے کلمات میں اس اندازِ تاثر کی دعوت کا بھی تذکرہ پایا جاتا ہے۔

ایک مرتبہ آپ نے انصار کے مجمع میں "فَسِيقَ الَّذِينَ كَفَرُوٓا إِلَىٰ جَهَنَّمَ زُمَرًا" کی تلاوت کی اور اصحاب نے گریہ شروع کر دیا۔ صرف ایک صحابی نے کہا کہ حضور میں متاثر ضرور ہوں لیکن میری آنکھوں سے آنسو نہیں نکل رہے ہیں تو آپ نے فرمایا کہ کوئی حرج نہیں ہے۔ "مَنْ تَبَاكَىٰ فَلَهُ الْجَنَّةُ"۔ جو رونے والوں کی شکل بنا لے گا اس کے لئے بھی جنّت ہی ہے۔ (کنز العمال ۱/۱۴۷)

جریر راوی ہیں کہ ایک مرتبہ سرکارؐ نے اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ کی تلاوت کر کے

فرمایا " مَنْ بَکٰی فَلَہُ الْجَنَّۃُ وَ مَنْ تَبَاکٰی فَلَہُ الْجَنَّۃُ " جو روئے گا اس کے لئے بھی جنت ہے اور جو آیات سے متاثر ہوگا اس کے لئے بھی جنّت ہے چاہے آنکھوں سے آنسو نہ نکلیں۔ (کنز العمال ١/ ١٤٨)

حضرت ابوذر نے حضورؐ سے روایت کی ہے کہ اگر تم میں سے کسی کے امکان میں رونا ہو تو روئے ورنہ حزن و غم کو دل کا شعار بنا کے اظہارِ غم ضرور کرے اس لئے کہ سنگدل انسان اللہ سے دور ہوتا ہے۔ (اللولو والمرجان ص ٤٧، مجموعہ ورام ص ٢٧٢)

ائمہ معصومینؑ کے روایات میں اس مضمون کی روایات بہ کثرت پائی جاتی ہیں، جیسا کہ صادق آلِ محمدؑ کا ارشاد ہے " مَنْ تَبَاکٰی فَلَہُ الْجَنَّۃُ " (امالی الصدوق ص ٨٦) اور خود امام حسینؑ نے بھی فرمایا تھا کہ میں کشتہ گریہ ہوں جب کوئی مومن مجھے یاد کرے گا تو متاثر ضرور ہوگا۔

اس مقام پر یہ ذکر کر دینا نامناسب نہ ہوگا کہ حدیث میں مَنْ بَکٰی اَوْ اَبْکٰی اَوْ تَبَاکٰی وَجَبَتْ لَہُ الْجَنَّۃُ " اس ترتیب کے ساتھ غالباً وارد نہیں ہوئی ہے اگرچہ اس کا مفہوم متعدد روایات میں موجود ہے لیکن مضمون کا صحیح ہونا اور ہے ــــ اور الفاظ کا مرتب شکل میں ہونا اور ہے ــــ عجب نہیں کہ اہلِ علم نے اپنی سہولت کے لئے ان اجزاء کو ایک مقام پر مرتب کر لیا ہو۔

اس مقام پر یہ تذکرہ صرف اس لئے کیا گیا ہے کہ اگر کسی صاحبِ نظر کی نظر سے حدیث گذر جائے تو مجھے باخبر کر دے تاکہ میں اپنے معلومات میں اضافہ کروں اور آئندہ اس کی اصلاح کر سکوں۔

گریہ و بکا کے جواز و استحباب کی بحث کے بعد اس امر کی طرف توجہ بے حد ضروری ہے کہ انھیں روایات میں گریہ کی شرعی حدوں کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا ہے۔ مرسلِ اعظمؐ کا ہچکی بندھ جانے تک رونا ــــ اور امام رضاؑ کا یہ ارشاد کہ " روزِ عاشورہ نے ہماری آنکھوں سے اشکوں کا سیلاب رواں کر دیا ہے اور ہماری پلکوں کو زخمی کر دیا ہے اور پھر حضرت یعقوبؑ کی آنکھوں کا سفید ہو جانا اس امر کی علامت ہے

کہ گریہ کی کوئی حد متعین نہیں ہے۔ اس مسئلہ میں حتی المقدور اہتمام کرنا چاہیئے۔ اور غمِ حسینؑ کو واقعی اپنے امام کا غم سمجھ کر منانا چاہیئے۔ محبت کے جذبات دنیا کے استہزاء سے پامال نہیں ہو سکتے ہیں اور شریعت کے احکام جہلاء کے تمسخر سے متغیر نہیں ہو سکتے ہیں۔

مجلس:

مجلس، اس اجتماع کا نام ہے جہاں مختلف افراد جمع ہو کر مصائب سیّد الشہداءؑ بیان کرتے ہیں اور فضا و ماحول کے اعتبار سے رونے اور رُلانے کا فرض انجام دیا جاتا ہے۔

مجلسِ غم کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ تقاضائے فطرت بھی ہے اور سیرت اربابِ عصمت بھی ——— فطرتِ بشر اس بات کی خواہاں ہے کہ جب انسان پر کوئی مصیبت پڑے اور وہ غم زدہ ہو کر بیٹھے تو دو چار افراد اس کے گرد جمع ہو کر شریکِ غم ہو جائیں اور اس طرح سوگواروں کی تسلّی کا سامان فراہم کریں۔

غم والم کے ماحول میں مخلصین کا اجتماع اور ان کا شریکِ غم ہو جانا بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اس کی اہمیت سے کوئی ایسا انسان انکار نہیں کر سکتا ہے جس نے مصیبت کے دن دیکھے ہوں اور احساسِ تنہائی کی اثر انگیزی کا مطالعہ کیا ہو۔

مرسلِ اعظمؐ نے بھی انھیں خصوصیات کے تحت جب کوئی خبرِ غم آپ تک پہنچی تو اسے مجمعِ اصحاب میں بیان کیا تا کہ اجتماعی غم کی اہمیت کا اندازہ ہو سکے اور اصحابِ کبار اسے میری محبوب سیرت سمجھ کر اختیار کر سکیں۔

حضرت جعفر طیارؑ کی خبرِ شہادت مجمعِ اصحاب میں سُنائی ——— ولادت کے موقع پر امام حسینؑ کی خبرِ شہادت اصحابؓ کے مجمع میں پیش کی اور اس موقع پر یزید پر لعنت بھی کی جس سے مجلس کے اس اہم مقصد کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے کہ مجالسِ غم ظلم کے خلاف جذبۂ نفرت کے اُبھارنے کا بہترین وسیلہ ہیں۔ (معجم کبیر طبرانی۔ تاریخ ابن عساکر۔ مقتل خوارزمی ص ۱۶۰)

قیدِ شام سے رہا ہونے کے بعد جناب زینبؑ کی پہلی تمنّا یہ تھی کہ دیارِ ظلم میں ایک مکان مل جائے جہاں بھائی کے غم کی بنیاد ڈال دی جائے۔

حضرت سجادؑ نے دربارِ یزید میں سرِ منبر اپنے مصائب کو بیان کر کے اس سیرت کی طرف متوجہ کیا اور پھر مدینہ واپس آ کر مجلسِ غم برپا کی اور اس میں اپنی زبانِ مبارک سے کربلا کے چشم دید واقعات بیان کئے۔ جو بعد میں تاریخ نویسوں کے لئے شمعِ راہ بنے۔

امام جعفر صادقؑ نے فضیل بن یسار سے فرمایا ـــــ "کیا تم لوگ آپس میں بیٹھ کر گفتگو کرتے ہو؟"

فضیل نے عرض کی بیشک!

فرمایا، میں ایسی مجلسوں کو دوست رکھتا ہوں جہاں امرِ آلِ محمدؐ کا احیاء کیا جاتا ہے۔ جو شخص بھی ان مجلسوں میں بیٹھ کر ہمارے امور کو زندہ کرے گا اُس کا قلب روزِ قیامت مُردہ نہیں ہو سکتا ہے۔

مجلسوں کے اس انداز سے خود بخود واضح ہو جاتا ہے کہ مجلس صرف باہمی اجتماع کا نام نہیں ہے بلکہ اس میں ایک ایسے انسان کی ضرورت بھی ہوتی ہے جو بیان کے فرائض انجام دے ـــــ جو کام مذکورہ روایات میں حضرت رسولِ اعظمؐ ـــــ امام زین العابدینؑ ـــــ جناب زینبؑ جیسی عظیم شخصیتوں نے انجام دیا ہے ـــــ اور اس کے بعد یہ سلسلہ آلِ محمدؐ کے گھر میں برابر قائم رہا۔ جب بھی کوئی مرثیہ خوان آ گیا اس سے اپنے جدِّ مظلوم کا مرثیہ پڑھوایا اور تمام گھر نے گریہ کیا ـــــ جناب دعبل ـــــ جناب کمیت وغیرہ کے نام اس سلسلے میں سرِ فہرست نظر آتے ہیں۔ ان حضرات نے معصومینؑ کی مجلسِ غم میں مرثیہ خوانی کے فرائض انجام دے کر اپنے نام کو ابدی حیثیت دے دی ہے۔

ماتم:

شدّتِ غم میں سر و سینہ پیٹنے کا اصطلاحی نام ماتم ہے۔ ماتم اظہارِ غم کا ایک

فطری ذریعہ ہے جو شدّتِ تاثر کے عالم میں منظرِ عام پر آتا ہے لیکن جس طرح کہ رونے کے لئے ہمیشہ شدّتِ تاثر ہی لازم نہیں ہے بلکہ غمزدہ شکل اختیار کرنا بھی المیہ سے متاثر ہونے کی ایک علامت ہے۔ اسی طرح وارفتگی کے ساتھ سر و سینہ پیٹنا ہی کوئی ضروری نہیں ہے بلکہ ہوش و حواس کے ساتھ بھی ایسا عمل انجام دینا ایک امرِ مستحسن ہے اور درحقیقت یہ ان سوگواروں کے غم میں شرکت کے مترادف ہے جن کے شدّتِ غم سے تاثر کا نقشہ روایات میں ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے۔

سیدانیوں نے غمِ حسینؑ میں منھ پر طمانچے مارے اور حسینؑ اس بات کے حقدار ہیں کہ ان کے غم میں ایسے انداز اختیار کئے جائیں۔ (تہذیب ۲/۲۸۲)

تاریخ اسلام میں بھی اس سلسلے میں ایک فقرہ ملتا ہے کہ جب مرسلِ اعظمؐ کا انتقال ہوا تو اُمّ المومنین عائشہ نے دیگر عورتوں کے ساتھ منھ پر طمانچے مارے۔

(تاریخ ابوالفدار ۱/۱۶۰)

عاشورہ کے دن سیدانیوں کے جلتے خیموں سے باہر نکلنے کا منظر بھی انھیں الفاظ میں پیش کیا گیا ہے "عَلَى الْوُجُوْہِ لَاطِمَاتٍ" منھ پر طمانچے مارتی ہوئی حضرت حبیب ابن مظاہر جنھیں امام حسینؑ نے مردِ فقیہ کے لقب سے یاد فرمایا تھا ـــــ وہ بھی جب امامؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور جناب زینبؑ نے ان کو سلام کہلا بھیجا تو تاریخ کا فقرہ ہے کہ "لَطَمَ الْحَبِيْبُ عَلٰى خَدِّہٖ" حبیب نے اپنے منھ پر طمانچے مارے اور سر پر خاک اُڑانا شروع کر دی۔

ان روایات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سر و سینہ پیٹنا تقاضائے فطرت کے علاوہ شرعی رجحان بھی رکھتا ہے اور اس کے نمونے معصومینؑ کی تقریر کی شکل میں مختلف حالات میں نظر آجاتے ہیں۔

رہ گیا زنجیر و شمشیر کا ماتم یا آگ پر ماتم تو اگرچہ ان کے نمونے تاریخ معصومینؑ میں کسی شکل میں نہیں ملتے ہیں اور نہ غالباً یہ اندازِ ماتم اس دور میں رائج تھا لیکن اس کے باوجود جواز کا معیار معصومؑ کا زمانہ نہیں ہے بلکہ ان کے ارشادات کی

وسعت ہے اور ارشادات میں یہ واضح کیا جاچکا ہے کہ جب تک حُرمت کا کوئی عنوان صادق نہ آجائے اس وقت تک جواز میں کوئی شُبہ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا اگر ان کا سلسلہ ہلاکتِ نفس کی حد تک نہ پہنچ جائے یا کسی علاقہ کے مخصوص حالات میں توہینِ مذہب کا سبب نہ ہو اور دشمنانِ اسلام اس طرح ملّتِ اسلامیہ پر دہشت گردی کا الزام نہ لگائیں تو اس کے جواز میں کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا ہے۔

شریعتِ اسلام کا تمام تر مدعا یہ ہے کہ چاہنے والے زندہ رہیں، باعزت رہیں اور ماتم کرتے رہیں۔ اس کا ہرگز یہ مقصد نہیں ہے کہ ماتم کرنے والے اپنی جان دے دیں اور اس طرح دھیرے دھیرے یہ سلسلہ ہی ختم ہو جائے۔

صنعتِ بشر:

مراسمِ عزا میں وہ امور جن کا تعلّق دستِ بشر کی صنّاعی سے ہے۔ ان کی بھی دو قسمیں ہیں:

ایک قسم وہ ہے جس کا اصل وجود ہی بشری صنعت کا نتیجہ ہے اور دوسری قسم کا وجود تخلیقِ الٰہی کا نتیجہ ہے لیکن عنوانِ عزا بشری صنعت سے پیدا ہوتا ہے۔

پہلی قسم میں عَلَم۔ تابوت۔ تعزیہ۔ ضریح۔ عماری وغیرہ کا نام آتا ہے اور دوسری قسم میں ذوالجناح وغیرہ کا نام لیا جاسکتا ہے۔

پہلی قسم کے جواز کے بارے میں یہ عرض کیا جاچکا ہے کہ اس کا کوئی تعلق مجسمہ سازی سے نہیں ہے اور نہ یہ ذی روح حیوان کی تصویریں ہیں۔

دنیائے اسلام میں اس کے رجحان کا بہترین ثبوت خود پیغمبرؐ کی قبر پر ضریح مقدس کا وجود ہے کہ اگر دنیائے اسلام میں ضریح کا بنانا حرام ہوتا تو مسلمان قبر پیغمبرؐ پر ایسی نامشروع صنعت کو کبھی برداشت نہ کرسکتے جب کہ وہاں قبر اطہر کو بوسہ دینے تک پر پابندی لگی ہوئی ہے۔

روایات میں اس اندازِ صنعت کا رجحان یہ ہے کہ ایک شخص نے حضور اکرمؐ سے گذارش کی کہ میں نے جنّت کی ڈیوڑھی اور حورالعین کی پیشانی بوسہ دینے کی

قسم کھائی ہے۔ اب اس قسم کو کیوں کر پورا کروں؟

تو آپ نے فرمایا کہ "ماں کے قدم اور باپ کی پیشانی کو بوسہ دو۔"

اس نے عرض کی کہ ان کا انتقال ہو چکا ہے۔

فرمایا کہ دونوں کی قبر کا بوسہ دو۔

اس نے کہا کہ قبر کا بھی پتہ نہیں ہے۔

فرمایا کہ نشانِ قبر بنا لو اور اس کو بوسہ دے دو۔ (کفایۃ الشعبی)

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قبر کا نمونہ بنانا جائز اور ایفائے نذر کے لئے ضروری بھی ہے اور کھلی ہوئی بات ہے کہ نذر و قسم کا تعلق انھیں چیزوں سے ہوتا ہے جن میں شرعی رجحان پایا جاتا ہو۔ لہٰذا اگر نگاہِ رسالت میں نمونۂ قبر کی عظمت نہ ہوتی تو آپ قسم کے ساقط ہو جانے کا حکم فرما دیتے اور نشانِ قبر کو بوسہ دینے کا حکم نہ فرماتے۔

ایسی حالت میں اگر والدین کی قبر کا نمونہ بنانا جائز ہے تو امام حسینؑ کی قبر کا نمونہ بنانا یا ان کے پرچم فتح کی شبیہ بنا کر اسے بلند کر کے اسلام کی سربلندی کا اعلان کرنا بطریقِ اولیٰ جائز ہوگا۔ اس علم برداری سے ہر اُس مسلمان کو ہمدردی ہونی چاہیے جو میدانِ جنگ میں اسلام کی فتح کا قائل ہے اور اس فتح کی یاد کو تازہ رکھنا چاہتا ہے۔

رہ گئی دوسری قسم تو اس بات کا ثبوت خود سرکارِ دو عالمؐ کا عمل ہے کہ آپ روزِ عید بچوں کے تقاضے پر ان کے لئے ناقہ کی شبیہ بن گئے اور آپ نے چاروں ہاتھ پیر سے راستہ طے فرمانا شروع کر دیا جسے دیکھ کر بعض اصحاب نے بچوں کو بہترین سواری کی مبارکباد دی۔ اور آپ نے ٹوک کر فرمایا کہ سواری کو نہ دیکھو۔ یہ دیکھو کہ سوار کس قدر باعظمت ہیں۔

جبرئیلِ امینؑ کا دحیہ کلبی کی شکل میں آنا بھی شبیہ بننے کا ایک بہترین جواز ہے کہ معصوم کوئی غیر مشروع عمل انجام نہیں دے سکتا ہے وہ ملک مقرب ہو یا نبی مرسل،

بہر حال سب معصومین ہیں۔

نوحہ۔ مرثیہ:

کسی عزیز کے فراق یا مرنے والے کی موت پر بین کرنے کے مختلف طریقوں کا نام نوحہ اور مرثیہ ہے۔ قانونی طور پر نوحہ و مرثیہ فطرت کی ایک آواز ہے جسے بقول غالب پابندِ نَے نہیں کیا جاسکتا ہے لیکن عام طور سے اِس اندازِ غم میں ردیف و قافیہ اور فنونِ شعر کا بھی لحاظ کیا جاتا ہے اور اس کا ایک بنیادی سبب یہ ہوتا ہے کہ نوحہ و مرثیہ کا ایک اہم مقصد غم والم کی فضا کو ساز گار بنانا ہوتا ہے جس میں شعر کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے اور یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ انسانی جذبات پر جس قدر نظم کا اثر ہوتا ہے نثر اثر انداز نہیں ہوتی ہے۔ نثر میں یکساں طور پر بیان ہوتا ہے اور نظم میں انفاس کے تموج اور احساسات کی جنبش پر بھی نظر رکھی جاتی ہے۔ نثر نگار حضرات بھی جب کلام کو زیادہ پُر تاثیر بنانا چاہتے ہیں تو مسجع و مقفیٰ بنا کر نظم سے قریب تر بنا دیتے ہیں۔

اسلامی روایات میں نوحہ و مرثیہ کا بکثرت وجود پایا جاتا ہے۔

مرسلِ اعظمؐ نے اپنے چچا حضرت ابو طالبؑ کا نوحہ پڑھا ہے۔ اپنے فرزند حضرت ابراہیمؑ کی موت پر کلماتِ غم ارشاد فرمائے ہیں۔

امیر المومنینؑ نے مرسلِ اعظمؐ اور صدیقہ طاہرہ فاطمہ زہراؑ دونوں کا مشترکہ نوحہ پڑھا ہے۔

جناب فاطمہؑ کا نوحہ فراقِ پدر میں "صبّت علیّ مصائب" شہرۂ آفاق ہے۔

خود امام حسینؑ نے کربلا کے میدان میں مختلف اصحاب اور اعزا کا مرثیہ پڑھا ہے۔

امام زین العابدینؑ میدانِ کربلا سے دربارِ یزید تک اور دربارِ یزید سے مدینہ تک برابر مرثیہ پڑھتے رہے ہیں۔

دیگر ائمہ معصومینؑ کی تاریخ میں بھی مختلف ایسی مجالس کا قیام ملتا ہے

جہاں شعراء وقت نے مرثیے پڑھے ہیں اور وہ مرثیے آج بھی زینتِ تاریخ بنے ہوئے ہیں۔

ان تاریخی حقائق کے ہوتے ہوئے ان روایات کے اطلاق پر کوئی توجہ نہیں دی جا سکتی ہے جن میں مرنے والے پر نوحہ کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ اس لئے کہ ان میں سے بعض روایات میں صریحی طور پر غلط بیانی کی قید لگا دی گئی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر نوحہ و مرثیہ میں مرنے والے کے ایسے حالات و کمالات بیان کئے جائیں جن کو حقیقت سے دور کا بھی لگاؤ نہ ہو تو وہ نوحہ و مرثیہ حرام ہو جائے گا لیکن یہ مرثیہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ غلط بیانی کے اعتبار سے ہوگا جس کا نوحہ و مرثیہ سے کوئی تعلق نہیں ہے کہ وہ بہر حال اور بہر وقت حرام ہے ــــ بلکہ بعض روایات میں تو مرنے والے پر نوحہ و ماتم کرنے کی اُجرت لینے تک کو جائز قرار دیا گیا ہے جیسا کہ ابو بصیر کی صادق آل محمدؐ سے روایت سے اندازہ ہوتا ہے۔

(الوسائل ۲/۲۴۲ ۵ باب کسب النائحہ)

سوز خوانی :

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ سوز کی دنیا نوحہ و مرثیہ سے بالکل الگ ہوتی ہے۔ سوز میں وہ بے ساختگی اور برجستگی ہرگز نہیں ہوتی ہے جو نوحہ و مرثیہ میں ہوتی ہے۔

ایک فطری طور پر مزاج شعر کا حامل، ہجوم مصائب میں برجستہ اشعار نظم کر کے اپنے غم و اندوہ کا مظاہرہ کر سکتا ہے۔ لیکن سوز خوانی کی مختلف دُھنوں کو ذریعۂ اظہارِ غم نہیں بنا سکتا ہے ــــ اس لئے نوحہ و مرثیہ کی واقعیت اور ان کی محبوبیت سے سوز کے رجحان پر استدلال نہیں کیا جا سکتا ہے ــــ البتہ اس کے اصل جواز کے دو رُخ ہیں۔

ایک عنوان ابکاء کا ہے جس میں یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ رُلانے کے ہر انداز کا اختیار کرنا محبوب و مستحسن ہے بشرطیکہ حدود شرع سے باہر نہ ہو ــــ اور ایک عنوان غناء کا ہے جس کا تقاضا ہے کہ گانا بہر حال اور بہر نوع حرام ہے چاہے اسے قرآن و حدیث ہی میں کیوں نہ استعمال کیا جائے۔

سوز خوانی کے خلاف سب سے بڑا اعتراض یہی ہے کہ اس کی مختلف دُھنوں میں غناء کا انداز پایا جاتا ہے اور غناء شریعتِ اسلام میں حرام ہے۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ اس مقام پر حرمت غناء اور اس کے مفہوم کو قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے تاکہ بہت سے دوسرے مسائل بھی حل ہو جائیں۔

مفہوم غناء:

غناء کی تعریف میں علماء لغت کے درمیان بے شمار اختلافات پائے جاتے ہیں اور اس کے مختلف اسباب میں سب سے اہم سبب یہ ہے کہ جن علماء نے لغت کی یہ کتابیں تالیف کی ہیں ان کی اکثریت فنِ غناء سے ناواقف اور اس کے خصوصیات سے بے بہرہ تھی ـــــ انھوں نے اس مفہوم کی طرف دور سے اشارے کئے ہیں اور کوئی ایسا جامع اور ہمہ گیر عنوان نہیں پیدا کیا جو غناء کے تمام افراد کو شامل اور اس کے جملہ خصوصیات پر حاوی ہو۔

میں ان حضرات کے بعض افادات کو نقل کرنے کے بعد حرمت غناء کے دلائل سے بحث کروں گا تاکہ ان کی روشنی میں یہ واضح کیا جا سکے کہ اگر لغوی اعتبار سے مفہوم غناء میں وسعت بھی پائی جاتی ہے تو دلائل کے اعتبار سے اس کی کتنی قسمیں حرام ہیں اور اگر لغوی اعتبار سے غناء کا دائرہ محدود ہے تو دلائل نے اس میں کہاں تک وسعت پیدا کی ہے۔

★ غناء آواز کی بلندی اور اس کے تسلسل کا نام ہے۔ (نہایہ ابن اثیر ۳/۱۸۷)

★ غناء طرب آمیز آواز کا نام ہے۔ (قاموس)

★ غناء طرب آمیز آواز ہے یا جسے اہلِ عرف غناء کہیں۔ (مجمع البحرین طریحی)

★ غناء صوت مطرب ـــــ طرب مع ترجیع ـــــ ترجیع ـــــ طرب ـــــ بلند آواز مع ترجیع ـــــ آواز کا کھنچاؤ ـــــ کھنچاؤ مع طرب یا مع ترجیع ـــــ حسن صوت ـــــ تسلسل صوت ـــــ صوت تحریک آمیز وغیرہ۔ (مستند)

★ صدائے بلند یا ترنم مخصوص۔ (فتح الباری ۲/۳۰۲)

* صدائے موجب حزن و مسرّت و سبکی بدن ۔ (مصباح ۔ اساس)

ان تعریفات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا اصل مفہوم واضح نہیں ہے اور یہ ایک حقیقت ہے جس کی طرف اشارہ کرنے کے لیے مختلف تعبیریں اختیار کی گئی ہیں جیسا کہ حضرت کاشف الغطار نے شرح قواعد میں فرمایا ہے کہ علمار کی تعریفات مفہوم عرف کی توضیح کے لیے ہیں لہذا اصل مرجع اور سند عرف عام ہے۔ علمار یا ان کے ارشادات نہیں ہیں۔

حکم غنار :

غنار کے بارے میں دو قسم کے تصوّرات پائے جاتے ہیں :

ایک تصوّر یہ ہے کہ غنار ذاتی طور پر حرام ہے جس طرح شراب و زنا وغیرہ ۔۔۔ اور دوسرا تصوّر یہ ہے کہ غنار ان اثرات و نتائج کے اعتبار سے حرام ہو جاتا ہے جو طرب انگیز آواز پر مرتب ہوتے ہیں لہٰذا اگر یہ آثار مرتب ہوتے ہیں تو غنار حرام ہے ورنہ حرام نہیں ہے۔

علمار شیعہ نے بالاتفاق اسے ذاتی طور پر حرام قرار دیا ہے۔ صاحب حدائق نے اس حکم کو غیر اختلافی اور صاحب جواہر نے اجماعی قرار دیا ہے۔ علمار اہلسنّت کی اکثریت بھی اسی مسلک کی حامل ہے۔

ابن حزم کا خیال ہے کہ اگر گانے کو معصیت کی غرض سے استعمال کیا جائے تو حرام ہے ورنہ مباح ہے۔ (المحلی ۹/۶۰)

علامہ عینی نے عمدۃ القاری ۵/۱۶۰ میں نقل کیا ہے کہ ابو حنیفہ، مالک اور احمد حرمت کے قائل ہیں۔

شافعی وغیرہ کراہت کے قائل ہیں اور عمر و عثمان و ابن عوف و سعد بن ابی وقاص و ابن عاص و ابن عمر وغیرہ جواز کے قائل ہیں۔

ابن حجر نے کف الرعاع برحاشیہ زواجر ۱/۳۰ پر علامہ بغوی کے شاگردوں سے نقل کیا ہے کہ غنار حرام ہے لیکن تنہا گھر میں کوئی حرج نہیں ہے۔

دلائلِ حُرمت:

غنا، کی حُرمت علمار شیعہ میں اجماعی اور علمار اہلِ سنّت میں اکثریت کا فتویٰ ہونے کے علاوہ متعدد آیات سے بھی ثابت کی جاسکتی ہے۔ یہ آیات اگرچہ حکمِ حُرمت میں صریح نہیں ہیں لیکن تفسیری روایات کو ملانے کے بعد استدلال بالکل مکمل ہوجاتا ہے۔

۱۔ وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّوْرِ (الحج)۔ غلط باتوں سے پرہیز کرو۔

۲۔ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّ يَتَّخِذَ هَا هُزُوًا (لقمان۔۶)۔ کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو لغو باتوں کو خریدتے ہیں تاکہ ان کے ذریعہ لوگوں کو راہِ خدا سے بہکا سکیں اور دین کا استہزار کرسکیں۔

چنانچہ آلوسی نے روح المعانی میں اکثریت علمار کا دعویٰ کیا ہے۔ صاحبِ ذخیرہ نے گناہ کبیرہ قرار دیا ہے۔

بدائع الصنائع میں اس کے گانے اور سننے دونوں کو معصیت کہا گیا ہے ۵/۱۲۹۔ مختصر الفتاویٰ المصریہ ص ۲۸۸ میں شیخ بدرالدین حنفی نے ابن منذر سے اتفاق علمار کا دعویٰ نقل کیا ہے۔

قاضی عیاض نے اس کے جاننے والے کے کفر کا فتویٰ دیا ہے۔

مدونۃ الکبریٰ ۳/۳۹۷ میں امام مالک کی طرف سے حُرمت کا فتویٰ نقل ہوا ہے ـــــ لیکن اسی کے برخلاف بعض علمار تفصیل کے قائل ہیں۔ جیساکہ حنفی علمار میں سرخسی اور شافعی علمار میں ابواسحاق شیرازی اور مازنی اس بات کے قائل ہیں کہ اگر غنار کے ساتھ کوئی اور فعلِ حرام شامل ہوجائے تو یہ حرام ہے ورنہ نہیں ہے۔ (مبسوط سرخسی ۱۳۲/۱۰۱، مہذب ۲/۲۳۴، مختصر مازنی ۵/۲۵۷)۔

مالکی علمار میں زرقانی کا یہ خیال ہے کہ اگر اس میں کوئی دوسرا حرام شامل ہوجائے تو بہر حال و بہر نوع حرام ہوگا۔ ورنہ شادی، ولادت، نکاح میں بہر صورت جائز ہے اور دیگر مقامات پر تکرار حرام ہے اور بغیر تکرار سُننا مکروہ ہے اور خود گانے کے بارے

میں بھی اختلاف ہے۔ (شرح مختصر ابی الضیاء ۷/۱۵۹)

۳۔ وَالَّذِیْنَ لَا یَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ (فرقان)۔ صاحبانِ ایمان کبھی غلط باتوں میں شرکت نہیں کرتے ہیں

مذکورہ بالا آیات میں قول زور۔ لہوالحدیث اور زور کی تفسیر گانے سے کی گئی ہے جو اس کے لفظی معنی نہیں ہیں لیکن ان الفاظ کے متعدد افراد مصادیق میں سے ایک مصداق ضرور ہے۔

پہلی آیت میں "قول زور" سے غنا کا مراد ہونا صرف علماء شیعہ کی تفاسیر میں ملتا ہے جیساکہ تبیان ۲/۵۴۲، مجمع البیان ۷/۸۲، تفسیر علی بن ابراہیم ۴۴۰، تفسیر اصفی ۴۸۲ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔

باقی دونوں آیتوں کا تذکرہ مفسرین اہلسنّت نے بھی فرمایا ہے جیساکہ الادب المفرد بخاری ص ۱۸۵، عمدۃ القاری ۱۰/۱۱۶، روح المعانی ۲۱/۶۷، اسباب النزول واحدی ص ۲۶۰، تفسیر ابن کثیر ۳/۴۲۸، تفسیر خازن ۵/۹۱ وغیرہ کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔

روایات اہلبیتؑ میں حسب ذیل مضامین خصوصیت کے ساتھ توجہ کے قابل ہیں:

۱۔ عبدالاعلیٰ کا بیان ہے کہ میں نے امام جعفر صادقؑ سے غنا کے بارے میں سوال کیا اور یہ کہا کہ بعض لوگوں کے خیال کے مطابق رسولِ اسلامؐ نے جِئْنَاکُمْ جِئْنَاکُمْ حَیُّوْنَا حَیُّوْنَا جیسے گیتوں کی اجازت دے دی تھی تو آپ نے فرمایا کہ یہ لوگ جھوٹے ہیں۔ اللہ لغویات کو پسند نہیں کرتا ہے۔ (وسائل ۲/۵۹۵)

۲۔ ابوبصیر وغیرہ نے امام صادقؑ سے نقل کیا ہے کہ گانا نفاق کا آشیانہ ہے۔ جس گھر میں گانا ہوتا ہے وہ آفتِ ناگہانی سے محفوظ نہیں رہتا ہے۔ اس میں دعائیں مقبول نہیں ہوتیں۔ فرشتۂ رحمت داخل نہیں ہوتا ــــــ اور گانے کے اجتماع کی طرف خدائے کریم نظر بھی نہیں کرتا ہے۔ شیطان گانے والوں پر مسلّط ہوجاتا ہے اور ان میں روحِ شیطنت پھونکتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ اس قدر بے حس ہوجائیں کہ ان کی عورتوں سے غلط رابطے قائم کئے جائیں اور انھیں غیرت نہ آئے۔ (کافی)

۴۔ امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں کہ کسی آواز کی طرف توجہ ایک قسم کی پرستش ہے، اس لئے جو خدائی باتوں کو سنتا ہے وہ بندۂ خدا ہوتا ہے اور جو شیطانی باتوں پر توجہ دیتا ہے وہ بندۂ شیطان ہوتا ہے۔ (وافی)

علماء اہلسنت میں بھی اس قسم کی روایتیں کنزالعمال ۷/۳۳۲، ۲/۲۰۰، مسند احمد ۵/۳۶۴ پر دیکھی جاسکتی ہیں۔

مسعدہ بن زیاد ناقل ہیں کہ میں صادقؑ آلِ محمدؐ کی خدمت میں حاضر تھا جب ایک شخص نے آکر عرض کیا کہ میں بیت الخلاء جاتا ہوں تو ہمسایہ کی لڑکیوں کی گانے بجانے کی آوازیں آتی ہیں اور میں بسا اوقات وہاں دیر تک بیٹھ جاتا ہوں۔ کیا یہ میرا عمل قبیح ہے؟ ــــ تو آپ نے فرمایا کہ خدا سے ڈرو۔ کیا تم نے یہ آیت نہیں سنی ہے کہ روزِ قیامت کان، آنکھ، دل سب سے سوال ہوگا۔

مسعدہ نے عرض کی کہ بیشک سنی ہے اور آج سمجھ بھی گیا ہوں ــــ اب میں توبہ کرتا ہوں اور آئندہ سے ایسا کام نہیں کروں گا ــــ تو آپ نے فرمایا توبہ یہ نہیں ہے ــــ اٹھو اور غسل کرکے نماز ادا کرو۔ اس کے بعد توبہ کرو ــــ تم نے بہت برا عمل کیا ہے۔ اگر کہیں اسی حالت میں مرجاتے تو کیا ہوتا؟ ــــ فعل قبیح برے ہی لوگوں کو زیب دیتا ہے ــــ (کافی)

مذکورہ بالا مقدمات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ علماء اسلام کی اکثریت گانے کی ذاتی حرمت پر متفق ہونے کے باوجود اس کی کسی ایسی تعریف سے عاجز ہے جسے معیار بنا کر افرادِ غناء میں امتیاز قائم کیا جاسکے اور یہ فیصلہ ممکن ہوسکے کہ حسنِ صوت کی کون سی قسم حدودِ غناء میں شامل ہے اور کون سی قسم ان حدود سے باہر اور جائز و مباح ہے ــــ لیکن اس کے باوجود یہ مسلّم ہے کہ گانے کا تعلق آواز کی کیفیت سے ہے چاہے وہ کیفیت طرب و حزن کے اعتبار سے ہو یا گٹکری وغیرہ کے اعتبار سے ہو یا کسی اور لحاظ سے ہو ــــ کہ نہ ہر اچھی آواز کو گانا کہا جاسکتا ہے اور نہ ہر طرب انگیز صدا کو غناء ــــ گٹکری کو بھی غناء کا معیار بنانا مشکل ہے ــــ ورنہ ہر دور سے دی جانے والی آواز غناء

اور حرام کی سرحد میں داخل ہو جائے گی۔

ایسے حالات میں دلائل حرمت کا سہارا لینا بے حد ضروری ہے تاکہ یہ فیصلہ کیا جاسکے کہ آیات و احادیث نے غنا کا اطلاق کس شے پر کیا ہے اور صاحبانِ شریعت کی نگاہ میں حُرمت کا تعلق کس شے سے ہے؟

آیات و احادیث کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں غنا کا معیار[1] صرف صوتی کیفیت نہیں ہے بلکہ وہ مادہ کلام بھی ہے جس پر یہ کیفیت صَرف کی جاتی ہے اور اسی لئے گانے کے لئے "لغویات"، "قولِ زور"، "لہو الحدیث" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور اس کے ایسے اثرات کا تذکرہ کیا گیا ہے جو صرف اچھی آواز پر مرتب نہیں ہوتے ہیں۔

گویا کہ لفظ غناء کے اطلاق میں دو شرطیں ہیں:

پہلی شرط یہ ہے کہ مادہ کلام غیر معقول، لغو، بے بنیاد اور یادِ خدا سے غافل کرنیوالا ہو۔ اور دوسری شرط یہ ہے کہ آواز طربناک اور پُرتاثیر ہو۔ لہٰذا اگر کسی مقام پر ان دونوں باتوں میں سے کوئی بات نہیں پائی جاتی ہے تو اسے گانا قرار دے کر حرام نہیں کہا جاسکتا ہے۔

سوز خوانی کی یہی حیثیت ہے کہ اس میں صوتی اعتبار سے تو غنائیت پیدا کی جاسکتی ہے لیکن مادہ کے اعتبار سے لغو و لاطائل اور یادِ خدا سے غافل کرنے والا کلام نہیں ہوسکتا ہے۔ سوز کی بنیاد اسی کلام پر ہوتی ہے جو واقعاتِ کربلا کو یاد دلاتا ہے اور واقعۂ کربلا

---

[1] موضوع غناء کے اکثر مباحث آیۃ اللہ العظمیٰ استاد علام حضرت ابو القاسم الخوئی طاب ثراہ کے محاضراتِ درس خارج سے لئے گئے ہیں۔ سرکار کے افادات انتہائی دقیق و عمیق تھے لیکن میں نے اپنی امکانی کوشش کی ہے کہ انھیں سہل ترین زبان میں پیش کیا جائے ــــ یہ بات بڑی حد تک میرے موضوع سے خارج بھی تھی لیکن دیگر مواقع زندگی میں بے پناہ افادیت کا خیال کر کے اسے پیش کرنے کی جرأت کی گئی ہے۔ خدا کرے اربابِ نظر ان بیانات سے فائدہ اٹھا سکیں اور پرستارانِ توحید ان پر عمل پیرا ہو کر نجاتِ اخروی کا سامان فراہم کر سکیں ــــ جوادی

ذکرِ خدا کا بہترین وسیلہ ہے ـــــ یہ اور بات ہے کہ بسا اوقات آواز کی کیفیت اتنی سنگین ہو جاتی ہے کہ مادہ کو محل غفلت میں ڈال دیتی ہے اور ذہن کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ ایسی صورت میں سوز حرام کے دائرہ میں داخل ہو جائے گا۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کو بھی غنائیت کے ساتھ پڑھنے کو حرام قرار دیا گیا ہے جب کہ خود امام زین العابدینؑ ایسے لہجہ سے قرآن کریم کی تلاوت فرمایا کرتے تھے کہ راہ گیر رُک کر آپ کی تلاوت سُنا کرتے تھے۔ مقصد یہ ہے کہ ایسا لہجہ نہ اختیار کیا جائے کہ سُننے والے پر قرآن کے بجائے صرف آواز کا اثر رہ جائے اور قرآن کریم بے اثر ہو جائے کہ یہ توہین قرآن ہے اور حرام ہے اور ظاہر ہے کہ یہ بات معصوم کے اندازِ تلاوت میں تصور بھی نہیں کی جا سکتی ہے کہ وہ لہجہ عصمت کا لہجہ ہے اور اس کا انداز عام انداز سے بالکل مختلف ہے جس کا روایتی ثبوت یہ ہے کہ اہلِ بازار حیرت زدہ ہو کر رُک جاتے تھے کہ وہ اپنے لہجہ سے بخوبی باخبر تھے۔

باجہ:

کھلی ہوئی بات ہے کہ رسوم عزا اور آدابِ غم و الم سے باجہ کا کوئی تعلق نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کا استعمال سوائے جلوسِ عزا کے اور کسی مقام پر نہیں ہوتا ہے اور اس کا مقصد بھی اظہارِ غم نہیں ہوتا ہے بلکہ اعلانِ جلوس ہوتا ہے۔

ہندوستان کے جلوسِ عزا میں مختلف قسم کے باجوں کا رواج تھا اور ان تمام قسموں کا کوئی ذکر روایات میں نہیں ہے اس لئے قانونی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو باجہ آلاتِ لہو و لعب میں شمار ہوتا ہے اور اس کا کوئی تعلق غم و الم یا اعلانِ عزا سے نہیں ہے بلکہ ایک قسم کی تسکینِ ذوق کے لئے استعمال کیا جاتا ہے وہ قطعی طور پر ناجائز ہے اور اس کے علاوہ دیگر اقسام اگر اپنے محلِ استعمال کے اعتبار سے عزاداری پر اثر انداز ہوتے ہیں تو ان کے جواز کی بھی کوئی وجہ نہیں ہے جیسا کہ میں نے خود اکثر مقامات پر دیکھا ہے کہ باجوں کے شور میں آوازِ نوحہ و ماتم دب جاتی ہے اور باجہ اعلانِ ماتم کے بجائے اخفائے غم کا وسیلہ بن جاتا ہے اور اہلِ دنیا نوحہ و ماتم سے زیادہ اس کی طرف توجہ دے کر عزا کی

عظمت کو مجروح کر دیتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ ایسی باتوں کے جواز کی کوئی وجہ نہیں نکل سکتی ہے البتہ وہ باجے جن میں طرب کا کوئی تصور نہیں ہے اور ان کا استعمال بھی صرف اعلان جلوس عزا کے لئے ہوتا ہے اور شریعت کا کوئی عنوان حرام بھی ان پر صادق نہیں آتا ہے ان کے حرام ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

میرے خیال میں ہندوستان کی عزاداری میں مختلف قسم کے باجوں کا دخل غیر اقوام سے شدید روابط کی بنا پر ہوا ہے کہ یہاں کی عزاداری ہمہ گیر اور آفاقی رہی ہے اور اس میں ہر قوم و ملت کا حصہ رہا ہے اور ہر قوم نے اپنے اصول و قواعد کے مطابق حصہ لیا ہے اس لئے دیگر اقوام نے اسی نکتہ کو اہمیت دی ہے۔

خصوصیت کے ساتھ وہ طبقے جن کا مشغلۂ حیات ہی یہی تھا انھوں نے عزا میں حصہ لینے کے لئے اپنے امکانی خدمات پیش کر دیئے ہیں۔

ضرورت تھی کہ ان کو روکے بغیر ایسا راستہ اختیار کیا جاتا کہ یہ بات انھیں تک محدود رہ جاتی اور اس کا دائرہ وسیع نہ ہو سکتا ــــ لیکن قیامت یہ ہوئی کہ بعض ارباب اقتدار و سیاست بھی انھیں امور کے دلدادہ تھے اس لئے انھوں نے احتیاط کی کوئی ضرورت نہیں محسوس کی اور جب محکوم طبقہ نے ان کی ادنیٰ دلچسپی کا احساس کر لیا تو اس میں مختلف انواع و اقسام کا اضافہ کر دیا تاکہ اپنے آقاؤں کو راضی رکھ سکیں اور ان سے بہتر سے بہتر جزا اور انعام حاصل کر سکیں۔

ارباب دین و دیانت اکثر اوقات ان باتوں سے بے خبر ہی رہتے ہیں اور ان کا کوئی خاص رابطہ ان امور سے نہیں رہا ہے اور جہاں کہیں ان امور کے اصلاح کی فکر بھی کی جاتی ہے وہاں اقتدار سدِّ راہ ہو جاتا ہے ــــ اور ”از ماتمِ حسینؑ می ترسم“ کا نعرہ ہزار حرکات و سکنات کے لئے ”جوشن صغیر“ بن جاتا ہے جب کہ اس کا وہ مفہوم ہرگز نہیں ہے جو عام طور سے تصور کیا جاتا ہے۔

وجوہِ خیرات:

نذر و نیاز اور تبرک وغیرہ کا براہِ راست کوئی تعلق مراسم عزا سے نہیں ہے۔

ان اشیاء کو ایک قسم کی عمومیت حاصل ہے اور عزاداری کے ذیل میں بھی ان امور کا سلسلہ قائم رہتا ہے اس لئے ضرورت ہے کہ ان کی نوعیت پر بھی قدرے روشنی ڈال دی جائے۔
دنیا کا کوئی قانون ایسا نہیں ہے جو کسی شخص کے حق میں کارِ خیر کی ممانعت کر دے اور اسے بدعت قرار دیدے۔

ایصالِ ثواب، ہدیۂ میت اور صدقات وغیرہ کے عناوین شریعتِ اسلام میں قدم قدم پر نظر آتے ہیں۔

ام المومنین عائشہ کی روایت ہے کہ ایک شخص نے حضور سرورِ کائناتؐ سے دریافت کیا کہ میری ماں کا اچانک انتقال ہو گیا ہے اور میرا خیال ہے کہ اگر اسے موقع ملتا تو وہ صدقہ وغیرہ دیتی۔ کیا میرے صدقہ دینے سے اسے ثواب مل جائے گا؟
فرمایا بے شک۔ (صحیح مسلم)

درحقیقت ایصالِ ثواب اور اموات مومنین کے نام پر کارِ خیر کرنا مذہبِ اسلام کا ایک امتیازی نقطہ ہے جس کا حق صرف اسلام کو پہنچتا ہے اور دیگر مذاہب میں اس کا سلسلہ ایک غیر بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ قرآن کریم نے اسلام و کفر کے نظریات کی ترجمانی کرتے ہوئے یہ واضح کر دیا ہے کہ اسلام "اِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ" کی تلقین کرتا ہے اور کفر "مَا یُھۡلِکُنَاۤ اِلَّا الدَّھۡرُ" کی تعلیم دیتا ہے۔ اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ اس موت کے بعد بھی ایک زندگی ہے جس میں بارگاہِ احدیت میں حاضر ہو کر زندگی کا حساب دینا ہے اور کفر کا خیال ہے کہ منزلِ موت پر حیات کا رواں دواں کارواں ٹھہر جاتا ہے اور اس کے بعد نہ زندگی رہتی ہے نہ محاسبۂ زندگی ــــ نہ مالک رہتا ہے نہ حسابِ بندگی۔

ان دونوں نظریات کا بنیادی فرق یہ ہے کہ اسلام بعد الموت زندگی کا قائل ہے اور کفر بعد الموت زندگی کا قائل نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ ایصالِ ثواب اور ہدیہ کا امکان اسی مذہب میں ہو گا جو مرنے والے کی بھی یک گونہ زندگی کا قائل ہو ورنہ معدوم اور فنا ہو جانے والے کے لئے نہ ایصالِ ثواب ممکن ہے اور نہ ایصالِ عذاب۔

اسلام نے ان باتوں پر اس لئے بھی زور دیا ہے کہ ان سے اسلام کے عقیدہ حیاتِ بعد الموت کی توثیق ہوتی ہے اور نفسِ مسلم پر جلا کا کام ہوتا ہے۔ مسلمان ایصالِ ثواب کرتے ہوئے یہ سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ اگر مرنے والا زندہ نہیں ہے تو یہ سارے اعمال کس کے لئے کئے جا رہے ہیں اور اس طرح حیات بعد الموت کا تصوّر اس کے عمل و کردار کے لئے محرک اعظم کا کردار انجام دیتا ہے۔

مرنے کے بعد تلقین کا سلسلہ بھی اسی تعلیم کے احیاء کے لئے ہے کہ اس عملِ خیر سے بھی قبر کے سرہانے بیٹھنے والوں کو متنبہ کیا جاتا ہے کہ موت فنا نہیں ہے اور موت کے بعد محاسبہ کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا ہے بلکہ قبر خود بھی محاسبہ و مواخذہ کی ایک منزل ہے اور حشر و نشر تو بہرحال برحق ہے جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ سننے والا ایک لمحہ کے لئے خوفِ خدا سے لرز جاتا ہے اور اس کے ذہن میں عقیدہ کی تڑپ عمل کی تحریک کا کام کرنے لگتی ہے اور اگر کسی مقام پر یہ نہیں ہوتا ہے تو کم از کم وہ اطمینانی تصوّر بھی قائم نہیں رہ جاتا ہے کہ موت کے بعد سکون ہی سکون ہے اور موت کی منزل ہر محاسبہ سے بالاتر ہے۔

ایصال ثواب کے لئے یہ بہرحال ضروری ہے کہ عمل کو شرعی طور پر جائز ہونا چاہئے جس کی مثال شریعت میں نماز، ہدیۂ میّت اور صدقات کی شکل میں ملتی ہے لیکن اس کے باوجود شہداء راہِ خدا کے نام پر تبرکات کی تقسیم، نذر و نیاز اور سبیل کے قائم کرنے کو کسی نقطۂ نظر سے بھی ناجائز نہیں قرار دیا جا سکتا ہے بلکہ اس مقام پر ایک قابلِ توجہ نکتہ یہ بھی ہے کہ عام مرنے والوں کی زندگی صرف روحانی حیات ہے جس کا بظاہر کوئی تعلق عالم مادیات میں تصرّفات سے نہیں ہے لیکن شہیدِ راہِ خدا کی زندگی ایک حقیقی زندگی ہے جس کے لئے اسلام نے لفظ موت کے استعمال یا اس کے تصوّر پر پابندی عائد کر دی ہے اور اس بات کو پسند نہیں کیا ہے کہ شہیدانِ راہِ خدا کو مُردہ کہا جائے یا انھیں مُردہ خیال کیا جائے۔

ایسی صورت میں اگر عام مُردوں کے لئے عملِ خیر اور ایصالِ ثواب ممکن ہے تو شہداء راہِ حق کے بارے میں بہرحال ممکن ہوگا جو بنصِّ قرآن زندہ بھی ہیں اور رزق بھی پا رہے ہیں۔ رزق پانے کا ذکر بھی اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ حیاتِ شہداء رزق سے

بے نیاز نہیں ہے اور پروردگار انہیں برابر رزق دے رہا ہے تو کیا اس کے بعد یہ مستحسن نہیں ہے کہ ہم ان کے نام پر راہِ خدا میں صدقات و خیرات دیں یا ان کی بارگاہ میں نذر و نیاز پیش کریں تاکہ پروردگار اس کے عوض میں ان کے اجر بے حساب میں مزید اضافہ فرمائے۔

نذرانہ :

عزاداری کی اصطلاح میں نذرانہ اس رقم کا نام ہے جو نثر و نظم میں تذکرہ سید الشہداء کرنے والوں کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے اور اس کے ذریعہ فروغِ عزا کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

ائمہ معصومین کی مکمل سیرت اس بات کی گواہ ہے کہ آپ حضرات نے اپنے دربار کے ذاکرین کو کافی انعام و اکرام سے نوازا ہے اور اس طرح تذکرہ فضائل و مصائب کی ترویج کا مکمل سامان فراہم کیا ہے۔

حیرت کی بات ہے کہ آج کی بڑھتی ہوئی بے دینی میں اس سیرتِ معصوم کو لغو و مہمل اور تجارت خونِ حسین سے تعبیر کیا جا رہا ہے اور اس بات پر قطعاً توجہ نہیں دی جاتی ہے کہ معصومین کرام نے کبھی خونِ مظلوم کی تجارت نہیں کی ہے اور نہ وہ اس بات سے راضی ہو سکتے ہیں۔

ذاکرینِ کرام کی بندہ نوازی انھوں نے بھی فرمائی ہے اور اسے ایک مستحسن اور ضروری عمل قرار دیا ہے۔

اگر یہ خونِ شہید کی تجارت ہوتی تو تجارت میں صرف بیچنا ہی حرام نہیں ہے بلکہ خریداری بھی حرام ہے تو پھر شکوہ کرنے والوں کو بھی یہ سوچنا پڑے گا کہ انھوں نے خونِ مظلوم کی کتنی مختصر قیمت لگائی ہے۔ (العیاذ باللہ)

مذکورہ بالا باطل توہمات اور مہمل تخیلات سے قطع نظر مسئلہ کی شرعی حیثیت پر توجہ دینا ضروری ہے اور یہ دیکھنا لازم ہے کہ نذرانہ کا شمار ہدیہ میں ہوتا ہے یا اُجرت میں؟

ہدیہ اور اُجرت کا بنیادی فرق یہ ہے کہ ہدیہ میں عمل کی نوعیت اور مقدار متعین نہیں ہوتی ہے بلکہ عمل کرنے والا اپنے عمل میں صاحبِ اختیار ہوتا ہے اور ہدیہ دینے والا اپنے ہدیہ میں آزاد ہوتا ہے نہ عمل کرنے والے کو ہدیہ پر اعتراض کرنے کا حق ہوتا ہے

اور نہ ہدیہ دینے والے کو عمل کرنے والے پر۔

اُجرت کی نوعیت اس سے بالکل مختلف ہے۔ وہاں عمل، نوعیتِ عمل، وقت اور مقدارِ عمل بلکہ جملہ خصوصیاتِ عمل و اُجرت کا تعین ضروری ہوتا ہے اور اس کی مخالفت پر معاملہ کا فسخ ہوجانا ناگزیر ہوجاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ نذرانہ ذکرِ اہلبیتؑ میں ایسی کوئی بات نہیں ہوتی ہے نہ ذکر کی کوئی پابندی ہوتی ہے اور نہ اُجرت کی۔ ذکر کے موضوع یا معاوضہ کی مقدار کا تعین باہمی تعاون کے لئے ہوتا ہے تاکہ بیان کرنے والا وہ باتیں بیان کرے جو سامعین کے لئے مفید ہوں اور خدمت کرنے والے وہ خدمت کریں جو بیان کرنے والے کے معاشیات کی کفالت کرسکے اور اسے زیادہ سے زیادہ محنت و مشقت کرنے کا موقع مل سکے۔

لیکن اگر کسی مقام پر یہ فرض کرلیا جائے کہ عمل اور اُجرت کا باقاعدہ طور پر تعین ہوتا ہے اور صورتِ معاملہ میں یہ قرارداد بھی ہوتی ہے کہ اس کی مخالفت میں معاملہ باطل ہوجائے گا اور عامل کسی اُجرت کا مستحق نہ ہوگا تو بھی شرعی طور پر یہ دیکھنا پڑے گا کہ ذکرِ فضائل و مصائب کوئی واجب عمل ہے یا مستحب ہے؟ اگر واجب ہے تو عبادات میں ہے یا معاملات میں ہے؟ اور اگر عبادت ہے تو عبادت پر اُجرت لینا جائز ہے یا نہیں ہے؟ ــــــ ان تینوں مسائل کے بارے میں قدرے تفصیل سے گفتگو کرنا ضروری ہے۔

صورتِ حال یہ ہے کہ واجبات کی دو قسمیں ہیں۔ بعض واجبات عبادت کی حیثیت رکھتے ہیں جن کی ادائیگی میں قصدِ قربت ضروری ہے اور بعض کی حیثیت اس سے قدرے مختلف ہے جہاں شریعت کا مقصود صرف عمل کا انجام پاجانا ہے اور قصدِ قربت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

پہلی قسم کی واضح مثال نمازِ پنجگانہ وغیرہ ہے اور دوسری قسم کی نمایاں مثال دفنِ میت ہے کہ نمازِ پنجگانہ میں شریعت کا مقصود نماز کا قائم ہوجانا نہیں ہے بلکہ ہر شخص کا براہِ راست قائم کرنا ہے اور دفنِ میت میں شریعت کا مطلب صرف مرنے والے کا دفن ہوجانا ہے۔

کسی خاص فرد کا یہ عمل انجام دینا ضروری نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ نماز واجب بہرحال واجب رہ جاتی ہے چاہے ساری دنیا نماز پڑھ لے اور دفنِ میّت کا وجوب میّت کے اتفاقیہ طور پر تلف ہو جانے سے بھی ساقط ہو جاتا ہے۔

محلِ بحث میں ان دونوں قسم کے واجبات سے بحث کی جائے گی اور یہ دیکھا جائے گا کہ واجبات پر اُجرت لینا جائز ہے یا نہیں؟

تفصیلی دلائل پر نظر کرنے سے پہلے یہ دیکھ لینا بھی ضروری ہے کہ اسلام میں وجوب کی تین صورتیں ہیں:

وجوب تخییری۔ وجوب تعیینی۔ وجوب کفائی۔

وجوب تخییری کا مطلب یہ ہے کہ عمل کو واجب قرار دے کر مختلف اعمال میں اختیار دے دیا جائے اور کسی ایک کا بجالانا بھی اصل وجوب کے ساقط ہو جانے کے لئے کافی ہو جیسا کہ ماہِ رمضان کے کفّارہ میں ہوتا ہے کہ مکلّف کو غلام کے آزاد کرنے، ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانے اور ساٹھ روزہ رکھنے میں اختیار ہوتا ہے اور اس کے ذمّہ ایک قدرِ مشترک واجب ہوتا ہے جس کا وجود کسی بھی عمل کے ذیل میں ہو سکتا ہے۔ فردِ عمل کا تعیّن کرنا عمل کرنے والے کے اختیار میں ہوتا ہے۔

وجوب تعیینی میں واجب کی فرد شریعت ہی کی طرف سے معیّن ہو جاتی ہے اور اس میں مکلّف کا کوئی اختیار نہیں ہوتا ہے۔

وجوب کفائی میں عمل کا تعیّن ضرور ہوتا ہے لیکن عمل کرنے والے کا تعیّن نہیں ہوتا ہے۔ یہاں شارع کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ یہ عمل مسلمانوں میں سے کسی ایک فرد کے ذریعہ انجام پا جائے جیسے تجہیز و تکفینِ میّت کہ یہاں فرد کی کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ اصل مقصد مرنے والے کا مکمّل احترام کے ساتھ آخری منزل تک پہنچ جانا ہے۔

گویا کہ فردِ مکلّف ایک قدرِ مشترک ہے جس کا تعیّن بظاہر عمل کے اقدام سے ہو جاتا ہے ورنہ تکلیف اپنی حالت پر اُس وقت تک باقی رہتی ہے جب تک کہ عمل درجۂ اتمام کو نہ پہنچ جائے۔

ان تمام مراحل پر نظر کرنے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ واجب تخییری اور واجب کفائی میں اُجرت لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے اس لئے کہ واجب تخییری میں واجب "قدرِ مشترک" ہے اور اُجرت فردِ خاص پر لی جا رہی ہے اور واجب کفائی میں مکلّف "قدرِ مشترک" ہے اور اُجرت طے کرنے والا فرد خاص ہوتا ہے۔ لہٰذا محلِّ اُجرت محلِّ وجوب سے بالکل مختلف ہے اور اس میں کوئی اشکال نہیں ہے۔

واجب تعیینی کی اُجرت کے بارے میں یہ بحث ہو سکتی ہے کہ جب شریعت نے ایک شخصِ خاص پر ایک عملِ خاص واجب کر دیا ہے تو اب اس کی اُجرت لینے کا جواز کیا ہے؟ لیکن اس سلسلے میں بھی یہ بات پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ واجبِ تعیینی کی بھی دو قسمیں ہیں: عبادت اور غیر عبادت۔

غیر عبادت میں صرف ایک اشکال ہے کہ واجب کی اُجرت یعنی چہ؟ اور عبادت میں دوہرے اشکالات ہیں جب خالق نے اس عمل کو اظہار عبدیت کا وسیلہ قرار دیا ہے تو بندہ کو بندگی کے اظہار پر اُجرت لینے کا کیا حق ہے؟ اور اُجرت کو نظر میں رکھنے کے بعد وہ خلوص کیونکر باقی رہے گا جو عبادات کا رکن اعظم اور عبدیت کا ستونِ محکم ہے۔

مسئلہ کو حل کرنے سے پہلے یہ بات نظر میں رکھ لینا ضروری ہے کہ عبادت کی روح امتثالِ امرِ الٰہی اور تعمیلِ حکمِ خداوندی ہے اور بس! اس سے زیادہ انتہائے خلوص کا مطالبہ اس انسان سے خلافِ حکمت و عدالت ہے جس کا خمیر ہی "حبِّ نفس" سے اٹھایا گیا ہے اور جس کا کوئی عمل ذاتی منفعت کی بنیاد سے بالاتر ہونا تقریباً ناممکن ہے۔ عذاب و ثواب، قربت و تقرب، جنت و جہنم یہ سارے مقاصد بھی ذاتی مفاد کی نشاندہی کر رہے ہیں چاہے اس کا تعلق آخرت ہی سے کیوں نہ ہو۔

جنت و جہنم کے تصور سے بلند تر ہو کر صرف استحقاقِ بندگی کی بنا پر عبادت کرنا انسانِ معصوم کا کام ہے اور یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے جا بجا عبادات کی بجا آوری پر جنت و ثواب اور ان کی مخالفت پر جہنم و عذاب کا ذکر کیا ہے اور یہ اس بات کا زندہ ثبوت ہے کہ عام انسان کا عمل اس سے بالاتر نہیں ہو سکتا ہے اور شریعت کا مطالبہ بھی اس سے زائد نہیں

ہے۔ وہ صرف یہ چاہتی ہے کہ بندہ مقامِ عمل میں حکمِ الٰہی پر نظر رکھے اور غیر خدا کی بندگی کا قصد نہ کرے۔

اب حکمِ الٰہی کی تعمیل میں اور کیا کیا باتیں پیشِ نظر ہیں ان پر کوئی پابندی نہیں ہو سکتی ہے اور اسی لئے سہو و نسیان سے بچنے کے لئے نماز جماعت اور طلب بارش کے لئے اصل نماز کو جائز بلکہ مستحب قرار دیا گیا ہے جو تمام تر ایک دنیاوی غرض ہے لیکن عمل کرنے والے کی نظر حکمِ خدا پر ہے کہ اس نے ان مقامات پر نماز مستحب قرار دی ہے یا جماعت کی تاکید کی ہے۔

ایسے حالات میں عبادت پر ملنے والی اُجرت کے بارے میں بھی یہ دیکھنا پڑے گا کہ عمل کرنے والا حکمِ خدا کی تعمیل کر رہا ہے اور مالِ دنیا مزید تحریک و ترغیب کا ذریعہ ہے یا عمل کرنے والے کی نظر میں حکمِ خدا کے بجائے صرف مالِ دنیا ہی ہے۔

ظاہر ہے کہ اگر کسی کی نظر میں صرف مالِ دنیا ہے تو اس کی عبادت کے صحیح ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے لیکن ایسا خیال عام طور سے خلافِ واقع بھی ہے اور کمالِ بدبختی بھی ہے کہ انسان حکمِ خدا کو مزید مستحکم بنانے کے بجائے اس کی مخالفت کو مقصدِ عبادت قرار دیدے۔ اور یہی وجہ ہے کہ شریعت نے مرنے والوں کی نماز وغیرہ میں اُجرت کو جائز قرار دے دیا ہے کہ نماز کا عبادت ہونا اپنی جگہ پر ہے اور مالِ دنیا کی بنا پر اس کی مزید تحریک کا پیدا ہو جانا اپنی جگہ پر ہے۔

یہ اُجرت نہ ہوتی تو صرف ایک بندۂ مومن سے عذاب کے برطرف کرانے کا احساس اتنا بڑا محرک نہیں بن سکتا تھا جتنا بڑا محرک معاوضۂ عمل بن جاتا ہے۔ معاوضہ نے نماز کو عبادت سے خارج نہیں کیا ہے بلکہ عبادت کی تحریک کو شدید تر بنا دیا ہے جس طرح کہ بہت سے افراد عمل واجب کی قسم کھا لیا کرتے ہیں کہ قسم کا احساس نفس کی کمزوری کو برطرف کر کے واجب کے احساس کو شدید تر بنا دے گا۔

مقصد یہ ہے کہ عمل کا عبادت ہونا اُجرت کے جواز کو چیلنج نہیں کر سکتا ہے اور جب عبادت اُجرت کے جواز کو مجروح نہیں کر سکتی ہے تو صرف واجب ہونا کیونکر اثر انداز ہو سکتا

ہے۔ اس لئے واضح طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلام میں قانونی طور سے واجبات پر اُجرت لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اس سلسلے میں نہ وجوب اثر انداز ہو سکتا ہے اور نہ عنوانِ عبادت! اور جب وجوب میں اُجرت کو حرام بنانے کی صلاحیت نہیں ہے تو مستحبات کا کیا ذکر ہے۔ ان پر اُجرت لینا تو بہر حال جائز ہے ــــ یہ اور بات ہے کہ بعض واجبات و مستحبات کے بارے میں خصوصیت کے ساتھ منشائے شریعت ہی ہے کہ انھیں بلا اُجرت انجام دیا جائے جیسے قضاوت۔ اذان۔ امامتِ جماعت وغیرہ کہ ایسے اعمال پر اُجرت لینا حرام ہے لیکن قانون کلّی کی بنا پر نہیں بلکہ ان مخصوص روایات کی بنا پر جو اس مقام پر وارد ہوئی ہیں اور جن کی بنا پر شریعت نے ان اعمال کا بلا اُجرت مطالبہ کیا ہے۔

مذکورہ بالا تفصیلات و تحقیقات کے بعد مجالس کا مسئلہ بالکل صاف ہو جاتا ہے کہ اوّلاً تو ذکر فضائل و مصائب کسی خاص فرد پر واجب نہیں ہے بلکہ احیائے امر اہلبیتؑ کے عنوان سے ہر محبِّ اہلبیتؑ کا فرض ہے لہٰذا ایسے اعمال پر اُجرت لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ لامذہب اور بے دین شعراء کے اشعار کو دلیل شرعی بنا کر نئی شریعت تیار کر دی جائے اور حکمِ خدا کے خلاف احکام نافذ کر کے جہنّم کا مکمل انتظام کر لیا جائے تو اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔

حیرت انگیز بات ہے کہ نامِ حسینؑ کی آڑ لے کر ذکرِ اہلبیتؑ کے نذرانہ پر ہزار فتاوائے حُرمت ہیں اور امام حسینؑ کے نام پر بننے والی عمارتوں کی اُجرت پر کوئی اعتراض نہیں ہے ــــ فرشِ عزاء اور سامانِ عزاء کے کپڑوں کے بیچنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے مجالسِ عزاء کے تبرّک کی خرید و فروخت پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔

مذکورہ بالا لامذہب شریعت کی بنا پر تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ذکرِ حسینؑ کا نذرانہ بھی حرام ہے ــــ مجلسِ حسینؑ کے تبرّک کی قیمت بھی حرام ہے ــــ اور عزائے حسینؑ کے سامان کی قیمت بھی حرام ہے ــــ اور اس طرح سارے سلسلۂ عزاء کا بند کر دیا جانا بھی ضروری ہے کہ یہ سارے کام بغیر اُجرت کے انجام نہیں پا سکتے ہیں۔

کیا اِس کا کھلا ہوا مقصد یہ نہیں ہے کہ ایسے افراد مقصدِ عزاء کو مجروح بنا کر اس کی

عظمت کو گھٹانا چاہتے ہیں اور ذکر حسینؑ کرنے والوں کی تعداد کو کم کر کے مجالسِ عزا پر پابندی عائد کرنا چاہتے ہیں ـــــ کیا حسینؑ کی دکھیا ماںؑ کا یہی مُدّعا تھا؟ کیا رضائے خدا و رسولؐ کی تحصیل کا ذریعہ یہی ہے ـــــ اس حقیقت کا اظہار بہر حال ضروری ہے کہ بعض مقامات پر اور بعض افراد ذکرِ حسینؑ کو واقعًا مالِ تجارت کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور بھاری بھاری اُجرتوں کے مطالبہ کے علاوہ جھگڑا بھی کرتے ہیں ـــــ ایسے افراد کا عمل جائز بھی ہو جائے تو اس سے کسی ثواب کی توقع نہیں کی جا سکتی ہے اور ذکرِ حسینؑ بھی وسیلۂ ثواب نہ بن سکا تو کون سا کام آخرت کے لئے کار آمد قرار پا سکتا ہے۔

ربِّ کریم ہمیں ہمارے نفس کے شر سے محفوظ رکھے اور جادۂ حق پر استقامت کی توفیق عطا فرمائے۔

وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی۔

جوادی

مُبارک سفر

فَسِيحُوا فِي الْأَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ۔

(روئے زمین پر چار مہینے سیر و سیاحت کرو) (قرآن کریم)

امینی طاب ثراہ۔ مقدر نے ہمیں ۱۳۸۴ھ میں جمہوریہ شام کے دیار کی زیارت کا موقع دیا تو ہم نے وہاں چار مہینے قیام کر کے وہاں کے عظیم کتب خانوں کا مطالعہ کیا۔ ان کی نادر و نفیس کتابوں سے استفادہ کیا جو اُمّت کے لئے حُفّاظِ احادیث اور ائمۂ فقہ و تفسیر کی علمی میراث کے طور پر محفوظ تھیں۔ ہماری ملاقات اُن اساتذہ و رجال فکر سے بھی ہوئی جن کی نفسیاتی کیفیات اور اعلیٰ اخلاقی اقدار نے ہمیں بیحد متاثر کیا۔ ان کا طرزِ معاشرت قابلِ قدر اور ان کا کردار لائقِ تحسین تھا۔ وہ اپنے اس اخلاق و کردار پر لامحدود شکریہ کے مستحق ہیں۔

اس سفر میں ۲۲ روزہ ہمارا قیام حلب میں رہا جہاں کی راتیں بیداری میں گذرا کرتی تھیں۔ رؤسائے شہر، اربابِ علم و فکر، فرزندانِ مذہب و عقیدہ کا اجتماع رہتا تھا اور طرح طرح کے مسائل زیرِ بحث آتے تھے۔ میں بھی ان مسائل پر امکانی روشنی ڈالتا تھا اور بسا اوقات یہ محفلیں ایک بجے رات تک کھنچ جاتی تھیں۔

اسی زمانے میں ہم نے علاّمہ استاذ شیخ محمد سعید دحدوح امام مسجدِ نوحیہ کی رفاقت میں حلب کے قومی کتب خانے کا معائنہ کیا۔ ہم مدیر کے کمرے میں بیٹھے ہوئے کتابوں کی فہرستوں کا بغور مطالعہ کر رہے تھے کہ یکایک ایک جلیل القدر انسان متبسّم انداز سے کمرے میں داخل ہوا اور استاذ سعید کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ دونوں میں راز کی باتیں ہونے لگیں۔ ہم نے بھی آہستہ آہستہ باتوں کو سُننے اور سمجھنے کی کوشش کی تو یہ سُنائی دیا کہ شیخ سعید ان بزرگ سے کہہ رہے ہیں کہ اپنے اعتراض کو علاّمہ کے سامنے پیش کرو ـــــ اور وہ کہہ رہے ہیں کہ یہ تو ہماری طرف رُخ بھی

نہیں کرتے ہیں ـــــ حضرت شیخ ایک مرتبہ میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا۔ حضرت علاّمہ! یہ بزرگ آپ سے ایک اعتراض کا جواب چاہتے ہیں؟ میں نے فوراً ان کے اعتراض کا استقبال کیا اور انھیں قریب بُلا کر اپنے پاس بٹھالیا۔ انھوں نے اپنے اعتراض کو ان الفاظ میں شروع کیا:

"میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ آپ جیسے علماء کے ہوتے ہوئے شیعہ حضرات محبّتِ اہلبیتؑ میں اس قدر غلو سے کیوں کام لیتے ہیں؟ آخر سارے مسلمان روزِ اوّل سے علیؑ اور اولادِ علیؑ سے محبّت کرتے ہیں اور ہم بھی ان کے چاہنے والے ہیں۔ پھر یہ عزاداری کیا ہے؟ یہ روزانہ "حسینؑ حسینؑ" کی پابندی کیا ہے؟ یہ تربتِ حسینؑ کی پرستش اور اُس پر سجدے کا التزام کیسا ہے؟"

ہمارے لئے استاذ موصوف کے یہ کلمات تازہ نہ تھے بلکہ دیارِ شام میں یہ باتیں بار بار کانوں سے ٹکرا چکی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سارے اعتراضات کسی ایک منحوس کارخانے کے ڈھلے ہوئے ہیں جس کا منشا مسلمانوں میں افتراق پیدا کرنا اور ان کے اجتماع کو تباہ کر کے ان کے کلمہ کو منتشر کر دینا تھا۔ کسی مخصوص پروپیگنڈے نے ان جراثیم کو پوری اُمّت میں پھیلا دیا ہے۔ اور اب یہ بلا عام ہو چکی ہے۔ جاہل عوام نے ان شہرتوں کو حقائق کا درجہ دے کر انھیں کو اپنا دین و ایمان سمجھ لیا ہے۔

ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے ان اسلامی بھائیوں کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے ایک مستقل کتاب تالیف کریں جس میں حقیقت کو واشگاف کر کے اُمّتِ اسلامیہ کو اپنے دینی مبانی و اصول سے آگاہ کریں۔ حقیقت بے نقاب ہو جائے اور حق کی پیشانی چمکنے لگے۔ مشکوک افراد کو ویسے ہی سکونِ نفس حاصل ہو جائے جیسے ان تمام حضرات کو ہوا ہے جن سے ہم نے گفتگو کی ہے اور جنھوں نے تعلیمِ قرآن کے مطابق اچھی بات کو سُنا تو اس کا اتباع بھی کیا۔ خدا نے انھیں حق کی ہدایت دی اور وہ صاحبانِ عقل و فہم تھے۔

تمہید:

محبّت اور نفرت دو ایسے قلبی واردات ہیں جن کی تعبیر میلانِ نفس اور اعراضِ قلب

سے کی جاتی ہے۔ جب انسان کا دل کسی شے کی طرف کھنچنے لگتا ہے تو اسے محبت کہتے ہیں اور جب دل اُچٹ جاتا ہے تو اس کی تعبیر نفرت سے کی جاتی ہے۔ کائنات کی کوئی بھی چیز مادی ہو یا معنوی، جزئی ہو یا کلّی، عالم امر سے متعلق ہو یا عالمِ خلق سے، عالمِ غیب کی ہو یا عالمِ شہود کی، ملکی ہو یا ملکوتی، سفلی ہو یا علوی، نوری ہو ناری، جوہری ہو یا عرضی، فردی ہو یا اجتماعی شخصی ہو یا نوعی، جسمانی ہو یا روحانی، دنیوی ہو یا اخروی ـــــ جب اسے نفس کے محکمۂ عدالت میں پیش کیا جاتا ہے ـــــ (وہ محکمۂ عدالت جو بغیر کسی انتظام کے خود بخود قائم ہو جاتا ہے اور اسی وقت مشغولِ عمل ہو جاتا ہے جب اس کے سامنے کوئی تصوّر یا تصدیق پیش ہو جاتا ہے) ـــــ تو اس کی تصویر دل کی گہرائیوں میں اُتر جاتی ہے۔ دل اس کی طرف جھکنے لگتا ہے یا اس سے بیزار ہو جاتا ہے اور اپنے اندر جگہ دینے سے انکار کر دیتا ہے۔ پہلی صورت کا نام محبت ہے اور دوسری صورت کا نام نفرت!

محبّت و نفرت جس طرح اپنے وجود میں اشیاء کی ان کیفیات و خصوصیات کی تابع ہیں جس کی بنا پر محبت و نفرت پیدا ہوتی ہے اسی طرح اپنی مقدار و منزل میں بھی انھیں کیفیات کی پابند ہیں، انھیں کیفیات سے ان کی حد بندی ہوتی ہے اور انھیں کی بنیاد پر ان کے درجات کا تعیّن ہوتا ہے۔ اسی بنا پر حقیقی ذات جو محبّت کی سب سے پہلی مستحق ہے ذات واجب الوجود تعالیٰ ہے جو ذات و صفات و افعال کے اعتبار سے کامل ہے۔ اس کی ہر صفت جلال و جمال، اس کا ہر نمونہ قدس و کمال، اس کی ہر دلیل عظمت و بزرگی، اس کی ہر نشانی رحمت و رافت اس بات کی مقتضی ہے کہ اس سے محبّت کی جائے اور ایسی محبّت کی جائے جس کی کوئی حد و انتہا معین نہ ہو ـــ اور ظاہر ہے کہ جب ہر صفت الگ الگ ایسی محبّت کی خواہاں ہے تو یہ تمام صفتیں یکجا ہو کر کس محبّت کی خواہاں نہ ہوں گی۔ حقیقتاً یہی محبّت وہ ہے جو انسان کو غلام بنا لیتی ہے اور اسے فطری طور پر عبادت و عبدیت کا خوگر بنا دیتی ہے۔

محبّت کا اوّلین حق ذاتِ واجب کے لئے ہے جو ہر کمالِ ذاتی سے آراستہ و مزیّن ہے۔ اس کے بعد جس میں بھی محبّت کا کوئی سبب اور داعی پایا جاتا ہے وہ درحقیقت اسی کے فضل اور کرم، جود و احسان کا نتیجہ ہے۔ سارے خیرات کا سلسلہ اسی کی ذات پر منتہی ہوتا ہے

اور ساری زندگیوں کا آغاز اسی کے چشمۂ رحمت سے ہوتا ہے اور تمام کامل نعمتوں کا آغاز اسی کے چشمۂ رحمت سے ہوتا ہے۔ وہ کامل نعمتوں کا عطا کرنے والا اور پاک و پاکیزہ عطیوں کا بخشنے والا ہے ــــ جو شخص بھی کسی غیر کو اس کے اوپر مقدم کرتا ہے۔ وہ حکم عقل کا باغی اور قانونِ منطق کا مخالف ہے۔ ممکن واجب سے آگے نہیں بڑھ سکتا ہے اور معلول علت پر مقدم نہیں ہو سکتا۔ ایسی نازیبا حرکت پر خداوند عالم مواخذہ بھی کر سکتا ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے "اگر تمھارے آباء و اولاد، برادران و ازواج، عشیرہ و اموال، تجارت و مکانات اللہ و رسولؐ اور جہاد فی سبیل اللہ سے زیادہ محبوب ہیں تو تم حکمِ خدا کا انتظار کرو" ــــ "اللہ فاسق قوم کی ہدایت نہیں کرتا ہے۔" (توبہ ۲۴)

اب چوں کہ صفاتِ واجب کی تحدید غیر ممکن ہے اور اس کی کوئی حد بندی نہیں کی جا سکتی ہے تو اس کے زیر اثر پیدا ہونے والی محبت کو بھی محدود نہیں کیا جا سکتا ہے۔ وہ کسی حد تک کیوں نہ پہنچ جائے اسے غلو نہ کہا جائے گا اس لئے کہ غلو حد سے تجاوز کرنے کا نام ہے اور اس کے کمالات کی کوئی حد معین نہیں ہے۔

اللہ کی محبت کے اعتبار سے ہر انسان ایک الگ درجہ رکھتا ہے اس لئے کہ محبت اگرچہ ذاتی اوصاف و خصوصیات کی بنا پر پیدا ہوتی ہے لیکن انسان کے دل میں اس کی جگہ علم و اطلاع کی بنیاد پر نکلتی ہے۔ جسے ان خصوصیات کا جس قدر علم ہوگا اتنی ہی اس کی محبت شدید ہوگی اور چوں کہ تمام افرادِ اُمّتِ مسلمہ اللہ کی معرفت میں یکساں نہیں ہیں اس لئے اس کی محبت میں بھی یکساں اور برابر نہ ہوں گے۔ ہر آدمی کا الگ ایک حصہ ہوگا اور ہر شخص کا الگ الگ درجہ ہوگا۔ نہ کوئی کسی کے علم میں شریک ہو سکتا ہے اور نہ کسی کی معرفت و محبت میں حصہ دار ہو سکتا ہے۔

یوں تو اللہ کی محبت ہر شخص میں بقدرِ علم و معرفت پیدا ہو سکتی ہے لیکن یہ محبت نتیجہ خیز اسی وقت ہوگی جب اس کا تعلق طرفین سے ہو۔ اس لئے بندہ کا فرض ہے کہ اپنے اندر بھی ایسے کمالات پیدا کرے جن کی بنیاد پر خدا اس سے محبت کرنے لگے جیسا کہ اس نے خود وعدہ کیا ہے کہ "اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو نبیؐ کا اتباع کرو تا کہ خدا تم سے محبت کرنے

لگے"۔ (آل عمران ۳۱)

ایسے دوست دارانِ الوہیت کی جماعت میں سرفہرست مولائے کائنات امیرالمومنین حضرت علی علیہ السّلام کا نام آتا ہے جن کو رسول اکرمؐ نے روزِ خیبر اسی صفت سے پہچنوایا تھا۔ "کل ایسے شخص کو علم دوں گا جو مرد ہو گا، خدا و رسولؐ کا دوست ہو گا اور خدا اور رسولؐ اس کے دوست ہوں گے۔" (اس حدیث کے تمام الفاظ و اسناد ہم نے اپنی مفصّل کتاب الغدیر میں نقل کر دیئے ہیں)۔

ظاہر ہے کہ جب محبّت طرفین سے ہو جائے گی تو بندہ خدا کی کسی عنایت سے محروم نہ رہ سکے گا اور فضیلتیں اس کے گرد حلقہ بگوش رہیں گی۔ تقرّب کی وہ منزل ہو گی جس کی نقشہ کشی حدیث قدسی کے حوالے سے امام بخاری نے ان الفاظ میں کی ہے:

"میرا بندہ نوافل کے ذریعہ مجھ سے قریب ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اسے چاہنے لگتا ہوں اور جب میں اس سے محبّت کرتا ہوں تو اس کے لئے کان، آنکھ، ہاتھ، پاؤں کا درجہ پیدا کر لیتا ہوں۔ میرے ہی ذریعے سنتا ہے اور میرے ہی ذریعہ دیکھتا ہے، میرے ہی وسیلہ سے حملہ کرتا ہے اور میرے ہی وسیلے سے قدم آگے بڑھاتا ہے۔ وہ جب کچھ مانگتا ہے تو میں دے دیتا ہوں اور جب کسی چیز سے پناہ مانگتا ہے تو بچا لیتا ہوں۔" (بخاری ۷/ ۱۹۰ باب التواضع من کتاب الرقاق)

درحقیقت یہی اللہ کا مقرّب بندہ ایک واسطہ کی حیثیت پیدا کر لیتا ہے جس کے ذریعے بندے اللہ سے قریب ہوتے ہیں، دنیا و آخرت کی سعادت حاصل ہوتی ہے۔ اہلِ ایمان کی نجات و فلاح کا سامان ہوتا ہے۔ آسمان سے برکتیں نازل ہوتی ہیں ـــــ اور یہی خدا کے بعد ساری کائنات میں محبوب بننے کا زیادہ حقدار ہوتا ہے جیسا کہ بعض کتب صحاح میں آنحضرتؐ کا ارشاد ملتا ہے:

"اللہ سے محبّت کرو کہ وہ تمھیں غذا دیتا ہے اور مجھ سے محبّت کرو کہ اللہ مجھ سے محبّت کرتا ہے اور میرے اہلبیتؑ سے محبّت کرو کہ میں ان سے محبّت کرتا ہوں۔"

(صحیح ترمذی ۱۳/ ۲۰۱، مستدرک ۳/ ۱۴۹، تاریخ بغداد ص ۱۶۰)

رسولِ اکرمؐ سے کائنات کی محبت کی یہ ایک جہت ہے ورنہ آپ کی شخصیت میں محبت کے لاتعداد اسباب و مقتضیات پائے جاتے ہیں جن میں بعض کا تعلق آپ کا خداوند عالم سے گہرے تعلق سے ہے اور بعض کا تعلق آپ کے فضائل و مناقب سے ہے۔

آپ کی شخصیت میں اگر طینت و اصل کی پاکیزگی، خلقت و اخلاق کی بلندی، ولادت و نشوونما کی عظمت، اخلاق و نفسیات کی رفعت، کرامات و مقامات کی کثرت، صفات و کمالات کی جامعیت سے قطعِ نظر بھی کر لیا جائے اور صرف یہ دیکھا جائے کہ آپ کی ذاتِ اقدس اس کائنات کی تخلیق کی غرض ہے کہ آپ نہ ہوتے تو زمین کا فرش اور آسمان کی بلندی نہ ہوتی، انسان قابلِ ذکر مخلوق نہ ہوتا اور دنیا میں کسی ذرے کا پتہ نہ ہوتا۔ آپ وجود کی غرض و غایت اور اللہ کے بعد ولایت عامہ کے حقدار ہیں ـــــ تو اتنا اعتبار بھی آپ سے محبت کرنے کے لئے کافی و وافی ہے بلکہ اس امر کا مستحق ہے کہ آپ سے اتنی شدید محبت کی جائے جو اپنے نفس و بدن، اہل و عیال، مال و منال، آباء و اولاد، برادران و ازواج وغیرہ سے نہ ہو۔

ظاہر ہے کہ جس طرح اُمتِ مسلمہ اللہ کی محبت میں یکساں نہیں ہے اسی طرح رسول اکرمؐ کی محبت میں بھی یکساں نہ ہوگی۔ یہاں بھی معرفت کے اختلاف کے اعتبار سے محبت کے درجات میں اختلاف ہوگا۔ امام قرطبی کا بیان ہے کہ جو بھی حضور پر صحیح ایمان لایا ہے وہ اپنے نفس کو حضور کی محبت سے خالی نہیں پا سکتا ہے۔ اس کے بعد لوگ محبت میں مختلف ہیں۔ بعض محبت کے اعلیٰ درجہ پر فائز ہیں اور بعض ادنیٰ درجہ پر جیسے وہ افراد جو خواہشات میں غرق اور دنیا داری میں ڈوبے ہوئے ہیں لیکن ان میں بھی بہت سے ایسے لوگ ہیں جن کے سامنے حضرت کا ذکر آتا ہے تو آپ کی زیارت کے لئے تڑپ جاتے ہیں اور زیارت ان کی نظر میں مال و اولاد سے زیادہ عزیز ہو جاتی ہے، اس راہ میں ہر قربانی کے لئے تیار ہو جاتے ہیں اور اس کا احساس اپنے نفس کے اندر سے بغیر کسی خارجی محرک کے پاتے ہیں۔ بلکہ بعض لوگ تو ایسے ہیں جو آپ کی قبر کی زیارت اور آپ کے آثار کے مشاہدہ کے لئے بے چین رہتے ہیں اور ہر قربانی دینے کے لئے آمادہ ہو جاتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ یہ محبت پائیدار نہیں ہوتی ہے بلکہ مسلسل غفلتوں کی بنا پر زائل بھی ہو جاتی ہے

واللہ المستعان۔ (فتح الباری ابن حجر ا ص ۵۰۔۵۱)

اسی مسلم الثبوت قانون کی بنیاد پر کتب صحاح کی روایاتِ محبت کی توجیہ کی جائے گی جیسا کہ انس بن مالک نے حضورؐ کا قول نقل کیا ہے کہ "خدا کی قسم کوئی شخص بھی صاحب ایمان نہیں ہو سکتا ہے جب تک میں اس کے نزدیک باپ بیٹے اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ بن جاؤں۔" (صحیح بخاری ا ص ۹، صحیح مسلم ا ص ۴۹، مسند احمد ۳ ص ۱۷۷، ۲۰۷، ۲۷۵، ۴ ص ۱۱)

(واضح رہے کہ یہی روایت ابو ہریرہ سے بھی نقل ہوئی ہے لیکن اس میں ایک میں لفظ "ناس اجمعین" نہیں ہے اور ایک میں لفظ ولد، والد سے پہلے ہے۔ بہر حال مفہوم سب کا ایک ہے)۔

ایک روایت میں ہے کہ "جس میں تین باتیں پائی جاتی ہوں وہ ایمان کی حلاوت سے بہرہ یاب ہو سکتا ہے۔ ایک یہ ہے کہ خدا و رسولؐ اس کی نظر میں تمام دنیا سے زیادہ محبوب ہوں۔"

صحیح بخاری میں بھی تقریباً اسی قسم کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔

(بخاری ا ص ۱۰۔۱۱، ۷ ص ۸۲، ۸ ص ۵۶، صحیح مسلم ا ص ۴۸، ترمذی ۱۰ ص ۹۱، مسند احمد ۳ ص ۱۷۲، ۱۷۴، ۲۸۸)

عبداللہ بن ہشام راوی ہیں کہ میں حضور اکرمؐ کے ساتھ چل رہا تھا۔ آپؐ عمر بن الخطاب کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھے۔ عمر نے آپؐ سے کہا کہ آپ میری نظر میں میرے نفس کے علاوہ تمام دنیا سے زیادہ محبوب ہیں تو آپؐ نے پلٹ کر جواب دیا کہ یہ کچھ نہیں ہے جب تک میں تمہارے نفس سے زیادہ محبوب نہ بن جاؤں۔ عمر نے عرض کی، لیجئے یہ بھی ہو گیا۔ تو آپؐ نے فرمایا۔ اب؟

(بخاری ص ۲۱۸)

ابو بکر مالکی نے کتاب "المجالسۃ" کی جلد ہفتم میں انس کے طریق سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ "کوئی بندہ با ایمان نہیں بن سکتا ہے جب تک میں اس کے اہل و مال اور تمام انسانوں سے زیادہ محبوب نہ بن جاؤں۔" نصیبی نے فوائد میں ابو لیلیٰ انصاری کے طریق سے نقل کیا ہے کہ "کوئی بندہ اس وقت تک با ایمان نہیں بن سکتا ہے جب تک میں اس کے

نفس سے زیادہ، میری عزت اس کی عزت سے زیادہ اور میرے اہل اس کے اہل سے زیادہ محبوب نہ بن جائیں۔" (شعب الایمان بیہقی۔ ثواب ابوالشیخ۔ مسند دیلمی وغیرہ)

امام فخر الدین رازی تفسیر کبیر ۷، ص ۳۹۱ میں رقم طراز ہیں کہ "آلِ رسولؐ کے لئے دُعا ایک عظیم منصب ہے اور اسی لئے اس دعا کو تشہد کا تتمہ بنا دیا گیا ہے۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ وَارْحَمْ مُحَمَّدًا وَّاٰلَہٗ۔ حالانکہ یہ تعظیم کسی اور کے حق میں نہیں وارد ہوئی ہے اور انھیں باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ محبتِ آلِ محمدؐ ایک امر واجب ہے ــــ آپ کے اہلبیتؑ آپ کے ساتھ پانچ چیزوں میں مساوات رکھتے ہیں۔ تشہد میں صلوات و سلام کا استحقاق، طہارت، تحریم، صدقہ، محبت۔"

اسی قسم کی اور باتیں بھی علماء اسلام کے بیانات کے ذیل میں پائی جاتی ہیں جن کی ایک بڑی مقدار ہم نے کتاب "الغدیر" میں جمع کر دی ہے اور جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ رسولِ اسلام کی محبت کے بعد آپ کے اہلبیتؑ کا درجہ ہے۔ آپؐ کی محبت اہلبیتؑ کی محبت سے جُدا نہیں ہو سکتی اور نہ یہ ساری محبتیں خدا کی محبت سے الگ ہو سکتی ہیں۔ یہی فیصلہ کتاب و سنت کا ہے اور یہی اعلان عقل و منطق کا ہے۔

یوں تو رسولِ اسلام اور اہلبیتؑ کے اتحاد کے سلسلے میں بے شمار حدیثیں پائی جاتی ہیں لیکن ہم ان میں سے صرف بعض کو بطور نمونہ کے نقل کئے دیتے ہیں:

۱۔ "جس کا میں مولا ہوں اس کا علیؑ بھی مولا ہے۔" یہ حدیث سو سے زیادہ طریقوں سے وارد ہوئی ہے۔

۲۔ "علی مجھ سے ہیں اور میں ان سے، وہ میرے بعد ہر صاحب ایمان کے ولی و حاکم ہیں۔" (عمران بن حصین)

۳۔ "جس کا میں مولا ہوں اس کا علیؑ بھی مولا ہے۔"

۴۔ "جس کا میں مولا ہوں، اس کے علیؑ ولی ہیں۔" (سعد بن ابی وقاص)

۵۔ "جو مجھے، حسنینؑ کو اور ان کے ماں باپ کو دوست رکھے وہ روز قیامت میرے ساتھ میرے درجہ میں ہوگا۔" (ابو ہریرہ)

۶۔ "میری شفاعت میری اُمّت میں صرف ان کے لئے ہے جو میرے اہلبیتؑ سے محبّت کریں اور وہی میرے شیعہ ہیں۔" (حضرت علیؑ)

۷۔ "میرے اہلبیتؑ اور ان کے چاہنے والے حوضِ کوثر پر ساتھ ہوں گے۔" (حضرت علیؑ)

۸۔ "اپنی اولاد کو تین باتوں کی تنبیہ کرو۔ محبّتِ رسولؐ، محبّتِ اہلبیتؑ، قرأتِ قرآن۔" (حضرت علیؑ)

۹۔ "جو حسینؑ کا دوست ہے وہ میرا دوست ہے۔" (حضرت علیؑ)

۱۰۔ "میں اور علیؑ و فاطمہؑ و حسنؑ و حسینؑ اور ہم سب کے دوست ایک جگہ رہیں گے۔" (حضرت علیؑ)

۱۱۔ "خدایا میں حسنؑ کو دوست رکھتا ہوں تو اُسے اور اُس کے چاہنے والوں کو دوست رکھ۔" (ابو ہریرہ)

۱۲۔ "جو حسنینؑ کو دوست رکھے وہ میرا دوست ہے اور جو اُن سے دشمنی کرے وہ میرا دشمن ہے۔" (ابو ہریرہ)

۱۳۔ "خدایا میں حسنینؑ کو دوست رکھتا ہوں تو انھیں بھی دوست رکھ اور ان کے چاہنے والوں کو بھی۔" (ابو ہریرہ)

۱۴۔ "جو مجھ سے محبت کرتا ہے اُس کا فرض ہے کہ حسنینؑ سے محبّت کرے۔" (ابو ہریرہ)

۱۵۔ "اللہ میرا مولا ہے، میرے نفس سے اولیٰ ہے، اس کے سامنے میرا کوئی حکم نہیں ہے۔ میں صاحبانِ ایمان کے نفس سے اولیٰ ہوں، میرے سامنے ان کا کوئی حکم نہیں ہے اور جس کا میں ایسا حاکمِ مطلق ہوں اس کا علیؑ بھی حاکم ہے۔ علیؑ کے سامنے اس کا حکم نہیں چل سکتا ہے۔"

۱۶۔ "جو علیؑ کا دوست ہے وہ میرا دوست ہے اور جو میرا دوست ہے وہ خدا کا دوست ہے۔" (اُمّ سلمہ)

۱۷۔ "ہم اہلبیتؑ کا دوست صرف مومن متقی ہوگا۔" (علیؑ)

۱۸۔ "میرے اہلبیتؑ کی مثال تم میں سفینۂ نوحؑ کی مثال ہے اس پر جو سوار ہوا اس نے نجات پائی۔ اور جس نے روگردانی کی وہ ڈوب مرا۔ میرے اہلبیتؑ کی مثال تمہارے درمیان باب حطہ بنی اسرائیل کی ہے، جو اس سے داخل ہوا اس کے گناہ بخش دیئے گئے۔"

(ابوسعید خدری، ابوذر، زبیر)

۱۹۔ "جو مجھ سے جُدا ہوا وہ خدا سے الگ ہوگیا اور اے علیؑ جو تم سے الگ ہوا وہ مجھ سے الگ ہوگیا۔" (ابوذر، عبداللہ بن عمر)

۲۰۔ "اے علیؑ! جو تمہارا دوست ہے وہ میرا دوست ہے، اور جو تمہارا دشمن ہے وہ میرا دشمن ہے۔" (ابوذر غفاری)

۲۱۔ "آدمی روزِ قیامت اس وقت تک آگے نہیں بڑھ سکتا جب تک چار باتوں کا سوال نہ ہو جائے عمر کس کام میں صَرف کی؟ مال کہاں خرچ کیا اور کہاں سے حاصل کیا؟ ہم اہلبیتؑ سے محبت کی یا نہیں؟" (ابوذر، ابوہریرہ)

۲۲۔ "ایہا النّاس! جو علیؑ کا دوست ہے وہ میرا دوست ہے، اور جو میرا دوست ہے وہ خدا کا دوست ہے۔ جو علیؑ کا دشمن ہے وہ میرا دشمن ہے، اور جو میرا دشمن ہے وہ خدا کا دشمن ہے۔" (انس بن مالک)

۲۳۔ "جو علیؑ و فاطمہؑ و حسنینؑ کو دوست رکھے وہ میرا دوست ہے، اور جو اُن سے دشمنی کرے وہ میرا دشمن ہے۔" (زید بن ارقم)

۲۴۔ "میں تم میں دو گراں قدر چیزیں چھوڑے جاتا ہوں۔ کتاب اللہ اور میری عترت و اہلبیتؑ۔ یہ دونوں ہرگز جُدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ میرے پاس حوضِ کوثر پر پہنچیں۔" (اکثر رواۃ)

۲۵۔ "خدایا، میں حسنینؑ کو دوست رکھتا ہوں تو بھی ان سے محبت کر۔ جو اُن سے محبت کرتا ہے وہ میرا دوست ہے۔" (عبداللہ بن مسعود)

۲۶۔ "حسنینؑ پر میرے ماں باپ قربان۔ میرے دوستوں کا فرض ہے کہ ان سے محبت کریں۔" (عبداللہ بن مسعود)

۲۷۔ "میں نے تمھارے درمیان دو چیزیں چھوڑی ہیں کہ اگر تم ان سے متمسک رہو گے تو ہرگز گمراہ نہ ہو گے ــــ کتابِ خدا اور میرے عترت واہلبیتؑ۔" (جابر بن عبداللہ انصاری)

۲۸۔ "یا علیؑ تمھارا دوست صرف مومن ہو گا اور تمھارا دشمن صرف منافق ہو گا۔ (حضرت علیؑ)

۲۹۔ "آگاہ ہو جاؤ۔ علیؑ میرے نسب سے ہے۔ جو اس کا دوست ہے وہ میرا دوست ہے اور جو اس کا دشمن ہے وہ میرا دشمن ہے۔" (عبداللہ بن عمر)

۳۰۔ "رسولِ اکرمؐ کی آخری وصیت یہ تھی کہ میری جگہ میرے اہلبیتؑ میں رکھنا۔" (عمر بن الخطاب، عبداللہ بن عمر)

۳۱۔ "میں اپنے تمام ایمان لانے والوں اور تصدیق کرنے والوں کو وصیت کرتا ہوں کہ وہ علیؑ سے محبت کریں۔ ان کا دوست میرا دوست ہے اور میرا دوست خدا کا دوست ہے۔ ان کو ولی ماننے والا میری ولایت کا قائل ہے اور میری ولایت کا قائل خدا کی حکومت کا معترف ہے۔" (عمار بن یاسر)

۳۲۔ "علیؑ پرچمِ ہدایت، امامِ اولیاء، نورِ صاحبانِ اطاعت، کلمۂ اہل التقویٰ ہے۔ اس کا دوست میرا دوست ہے اور اس کا دشمن میرا دشمن ہے۔" (ابو برزہ اسلمی)

۳۳۔ "حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں۔ خدا اسے دوست رکھے جو حسینؑ سے محبت کرے۔" (یعلیٰ بن مرہ)

۳۴۔ "جو مجھ سے توسل کا خواہاں ہے اور یہ چاہتا ہے کہ روزِ قیامت میری شفاعت کا حق دار بن جائے اس کا فرض ہے کہ میرے اہلِ بیت سے تعلق رکھے اور انھیں خوش رکھے۔" (محمد بن علی)

۳۵۔ "کوئی شخص باایمان نہیں ہو سکتا ہے جب تک کہ میرے اہلبیتؑ سے محبت نہ کرے۔ عمر بن الخطاب نے عرض کی کہ محبتِ اہلبیتؑ کی علامت کیا ہے؟ آپ نے علیؑ کی پشت پر ہاتھ رکھ کر فرمایا: اس کی محبت علامت ہے۔" (سلمان فارسیؓ)

۳۶۔ "یا علیؑ تمھارا دوست میرا دوست، تمھارا دشمن میرا دشمن ہے اور میرا دشمن خدا کا دشمن ہے۔" (سلمان فارسیؓ)

۳۷۔ "آلِ محمدؐ کو وہ جگہ دو جو جسم میں سر کی ہے اور سر میں آنکھ کی، اس لئے کہ جسم بغیر سر کے ہدایت نہیں پا سکتا ہے اور سر بغیر آنکھوں کے۔" (سلمان فارسیؓ)

۳۸۔ خدا کی قسم کسی شخص کے دل میں ایمان داخل ہی نہیں ہو سکتا ہے جب تک وہ میرے اہلبیتؑ سے دوہری محبت نہ کرے۔ میری قرابت کی وجہ سے بھی اور خدائی قربت کی وجہ سے بھی۔" (عباس بن عبدالمطلب)

۳۹۔ "ایہا النّاس! میں تم کو محبتِ علیؑ کی تاکید کرتا ہوں۔ علیؑ کا دوست نہیں ہوگا مگر مومن اور ان کا دشمن نہیں ہوگا مگر منافق۔ ان کا دوست میرا دوست ہے اور ان کا دشمن میرا دشمن ہے۔" (عبداللہ بن حنطب)

۴۰۔ "آخر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے جو مجھ کو میرے اہلبیتؑ کے بارے میں ستاتے ہیں۔ خدا کی قسم کوئی شخص صاحبِ ایمان نہیں ہو سکتا ہے جب تک مجھ سے محبت نہ کرے اور مجھ سے محبت نہیں کر سکتا ہے جب تک میری وجہ سے میرے گھر والوں سے محبت نہ کرے۔"

(ابن عباس، ابوسعید الخدری، درّہ بنت ابی لہب)

ان احادیث کے اسناد و طرق کی تفصیل کتاب "الغدیر" سے معلوم کی جا سکتی ہے۔

ان احادیث کے علاوہ بے شمار حدیثیں ہیں جن میں اہلبیتؑ کی محبت کی اہمیت کو ظاہر کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ یہ محبت دین کے ضروریات، عقل کے فرائض اور محبتِ رسولؐ کے لوازم میں سے ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس محبت کی کوئی تحدید نہیں ہو سکتی ہے اور نہ کسی خاص حد کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اس لئے کہ محبت اپنے وجود میں مخصوص اسباب و علل کی تابع ہے اور انھیں اسباب کی بنا پر اس کے درجہ اور مرتبہ کا بھی تعین ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ جب ہم ان اسباب و علل، فضائل و کمالات کا احاطہ نہیں کر سکتے ہیں اور نہ تمام لوگ اپنے علم و عرفان میں مساوی ہی ہو سکتے ہیں تو کسی ایک حد اور مرتبہ کا تعین کس طرح صحیح ہو سکتا ہے، بلکہ میرا عقیدہ تو یہ ہے کہ اگر محبت کے بے شمار اسباب میں سے کسی ایک سبب کو بھی

نظرِ غائر سے دیکھا جائے اور اس کی حقیقت پر غور و خوض کیا جائے تو اندازہ ہو جائے گا کہ ان کی محبّت کا کوئی درجہ معین نہیں کیا جا سکتا ہے۔

موقفِ حساب:

اگر آپ کو تعیین کا شوق ہی ہے تو آئیے محبّت کے اسباب و علل پر غور کیجئے اور بتائیے کہ یہ اسباب کس درجہ کی محبّت کے مقتضی ہیں۔

۱۔ "اہلبیتؑ صاحبِ رسالت سے نسب و دامادی دونوں قسم کا رشتہ رکھتے ہیں اور صاحبِ رسالت کا کھلا ہوا اعلان ہے کہ روزِ قیامت تمام نسبی اور سببی رشتے منقطع ہو جائیں گے سوائے میرے رشتوں کے۔"

ظاہر ہے کہ ملوک و سلاطین اور رؤسا و عظماء سے ایسا تقرب رکھنے والوں کی منزل ہی کچھ اور ہوتی ہے۔

۲۔ خدا اور رسولؐ ان حضرات کو اپنا محبوب سمجھتے ہیں اور ان سے تمام مخلوقات سے زیادہ محبّت کرتے ہیں۔ جیسا حدیثِ خیبر اور حدیثِ طیر وغیرہ سے واضح ہے۔

۳۔ ان سے محبّت کرنے والا رسولِ اعظمؐ کی اس دعا کا مستحق ہو جاتا ہے" خدایا! ان کے دوست کو دوست رکھنا، ان کے مددگار کی مدد کرنا، ان کے ناصر کی نصرت کرنا، ان کے محبوب کو محبوب قرار دے لینا۔"

۴۔ ان کی محبّت نصِ قرآنِ کریم ختمِ نبوت کی اجرت ہے اور اس پر روزِ اوّل سے تمام اُمّت کا اجماع و اتفاق بھی ہے۔

۵۔ ان کی محبّت کے بارے میں عرصۂ محشر میں قدم قدم پر سوال کیا جائے گا "وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَسْئُوْلُوْنَ" اور بقول ابو سعید خدری "مَسْئُوْلُوْنَ عَنْ وِلَایَةِ عَلِیٍّ"۔

مفسّر کبیر واحدی کا ارشاد ہے کہ روزِ قیامت ہر شخص سے علیؑ اور اہلبیتؑ کی محبّت کے بارے میں اس لئے سوال ہوگا کہ رسولِ اکرمؐ نے اپنی تمام خدمات کے عوض میں کسی اُجرت کا تقاضا نہیں کیا ہے۔ اگر سوال کیا ہے تو صرف محبّتِ اہلبیتؑ کا۔ مطلب یہ ہے کہ ہر شخص سے سوال ہوگا کہ اس نے اہلبیتؑ سے اس طرح محبّت کی ہے یا نہیں جس طرح

رسولِ اکرمؐ نے حکم دیا تھا۔

علاّمہ ابن حجر نے صواعق میں ابوسعید خدری کی روایت نقل کر کے واحدی کے اس جملہ کا بھی اضافہ کیا ہے اور اس کی شرح اس طرح کی ہے کہ "جس طرح رسولِ اکرمؐ نے حکم دیا تھا" درحقیقت ان کثیر روایات و احادیث کی طرف اشارہ ہے جن میں حضورؐ نے محبّتِ اہلبیتؑ کی تاکید فرمائی ہے۔

ابوسعید کی حدیث اور واحدی کی اس تشریح کو بہت سے علمائے اسلام نے نقل کیا ہے اور بعض حضرات نے تو حدیثِ ثقلین کے اس ذیل سے بھی استدلال کیا ہے کہ: "اللہ روزِ قیامت تم سے سوال کرے گا کہ تم نے میرے بعد اس کی کتاب اور میرے اہلبیتؑ کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟"

ابوالمظفر سبطِ جوزی نے تذکرہ ص ۱۰ میں مجاہد کا یہ قول نقل کیا ہے کہ لوگوں سے ولایتِ علیؑ کے بارے میں سوال ہوگا۔

سید آلوسی نے اپنی تفسیر کی ۲۳ ویں جلد ص ۸۰ پر آیتِ مذکورہ کے ذیل میں بہت سے اقوال نقل کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ روزِ قیامت عقائد و اعمال کے بارے میں سوال ہوگا اور عقائد میں راس و رئیس لا الٰہ الّا اللہ ہے اور بلند ترین عقیدہ ولایتِ علی کرم اللہ وجہہ ہے۔

جمال الدین زرندی نے نظم الدّرر ص ۱۰۹ پر واحدی کے بیان کو بعینہٖ نقل کرنے کے بعد تحریر فرمایا ہے کہ: "علمائے مجتہدین اور ائمۂ محدثین میں کوئی ایسا نہیں ہے جس نے محبّتِ اہلبیتؑ میں وافر حصّہ نہ لیا ہو اور اس کو باعثِ فخر نہ سمجھا ہو۔ خود پروردگار نے آیتِ مودّت میں اس کا حکم دیا ہے۔ اس لئے ہر عالمِ دین انھیں پر اعتماد کرتا ہے، انھیں سے تمسّک کرتا ہے اور انھیں کی طرف اپنے کو منسوب کرتا ہے۔"

۶۔ اہلبیتؑ قرآن کریم کے ہمسر و ہم پلّہ ہیں جیسا کہ رسولِ کریمؐ نے حدیثِ ثقلین میں ارشاد فرمایا ہے۔ یہی ائمۂ ہدایتؑ ہیں اور یہی ہمسرِ قرآن، انھیں کے ذریعہ انسان گمراہی سے نجات پاتا ہے اور یہی پاکیزہ زندگی کی رہنمائی کرتے ہیں۔

۷۔ ان کی محبت ایمان کی علامت ہے جیسا کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ "اے علیؑ تمہارا دوست نہیں ہوگا مگر مومن، اور تمہارا دشمن نہیں ہوگا مگر منافق"۔ اس مضمون کی بے شمار حدیثیں ہیں۔ یہاں تک کہ صحابۂ رسولؐ نے اسی بات کی مبارکباد دی ہے جیسا کہ غدیر خم میں لاکھوں کے مجمع میں عمر بن الخطاب نے کہا تھا۔ "مبارک ہو مبارک ہو یا ابن ابی طالب، آج آپ میرے اور ہر مومن و مومنہ کے مولا ہو گئے"۔

یہی بات دار قطنی، ابن السمان، محب الدین طبری وغیرہ نے اس واقعہ میں لکھی ہے کہ عمر کے پاس دو اعرابی جھگڑا کرتے ہوئے آئے۔ انھوں نے حضرت علیؑ سے کہا یا ابا الحسن، آپ دونوں کے درمیان فیصلہ دیجئے۔ آپ نے فیصلہ کر دیا تو ایک آدمی نے طنز کیا۔ یہ ہمارے درمیان فیصلہ کریں گے؟ یہ سننا تھا کہ عمر بن الخطاب کو غیظ آگیا۔ جھپٹ کر اس کا گریبان پکڑ لیا۔ کہا خدا تجھے غارت کرے۔ جانتا ہے یہ کون ہیں؟ یہ میرے اور ہر مومن کے مولا ہیں۔ جو انھیں مولا نہیں مانتا ہے وہ مومن نہیں ہے۔

۸۔ ان کی محبت تمام افرادِ امت پر بلا استثنار واجب ہے۔ اگرچہ ان میں اولیار، علمار، صدیقین، شہدار اور صالحین سب ہی ہیں۔ اس بات کا صحیح اندازہ حاکم نیشاپوری کی اس نقل سے ہوگا جو انھوں نے کتاب المعرفۃ میں ابن مسعود سے روایت کی ہے کہ رسولِ کریمؐ نے فرمایا "اے عبداللہ میرے پاس ایک ملک آیا اور اس نے کہا کہ اپنے پہلے آنے والے رسولوں سے سوال کرو کہ انھیں کیوں مبعوث کیا گیا ہے، تو میں نے سب سے سوال کیا اور سب نے جواب دیا کہ آپ کی محبت اور علیؑ کی ولایت کی بنیاد پر"۔

حافظ ابو نعیم اصفہانی نے اس روایت کو ان الفاظ میں نقل کیا ہے کہ جب مجھے معراج میں لے جایا گیا تو چوتھے آسمان پر میں نے ایک یاقوتی مکان دیکھا۔ جبرئیل نے کہا یہ بیت معمور ہے۔ اس میں نماز پڑھئے۔ اس کے بعد پروردگار عالم نے تمام انبیار کو جمع کر دیا۔ سب میرے پیچھے صف باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے نماز سب کو پڑھائی۔ جب سلام پڑھ چکا تو ایک نمایندۂ الٰہی آیا اور اس نے کہا۔ اے محمدؐ! پروردگار تمھیں سلام کہتا ہے اور فرماتا ہے کہ ان تمام رسولوں سے یہ سوال کرو کہ انھیں رسالت کیوں دی گئی

ہے ؟ میں نے تمام مرسلین سے سوال کیا تو سب نے بالاتفاق جواب دیا کہ آپ کی نبوّت اور علیؑ کی ولایت کے طفیل میں۔

ظاہر ہے کہ یہ ولایت کسی آدمی کو مستثنیٰ نہیں کرتی ہے۔ انسان کسی عالم میں کسی جگہ ہو اس پر فرض ہے کہ اس محبّت کو سینے سے لگائے رہے۔ حالات کے بدل جانے سے نفسیاتی کیفیات بدل جایا کرتی ہیں لیکن محبّتِ اہلبیتؑ میں ذرّہ برابر فرق پیدا ہو جانا کسی طرح روا نہیں ہے۔

۹۔ ان کی محبّت صحیفۂ مومن کا عنوان ہے جیسا کہ حافظ ابو بکر خطیب نے تاریخِ بغداد میں نقل کیا ہے۔

۱۰۔ یہ حضرات سفینۂ نجاتِ اُمّت ہیں جیسا کہ حضورؐ کا ارشاد ہے۔ میرے اہلبیتؑ کی مثال کشتیٔ نوحؑ کی سی ہے۔ جو اس کشتی پر سوار ہو گیا نجات پا گیا اور جو الگ ہو گیا وہ ڈوب مرا۔

۱۱۔ دعا کرنے والوں کی دعاؤں کی قبولیت ان پر صلوات بھیجنے پر موقوف ہے جیسا کہ روایت میں ہے کہ ہر دعا کے سامنے ایک پردہ حائل رہتا ہے۔ جب صلوات شامل ہو جاتی ہے تو وہ پردہ ہٹ جاتا ہے اور دعا آسمانوں تک پہنچ جاتی ہے ورنہ واپس چلی آتی ہے۔

اس روایت کو ابو عبداللہ الحسین بن یحییٰ قطان بغدادی متوفی ۳۳۴ھ نے اپنی کتاب میں اپنے استاذ الحسن بن عرفہ بغدادی سے نقل کیا ہے۔ (بحمداللہ یہ کتاب میرے پاس موجود ہے۔ امینی)۔ اس کے علاوہ ابو محمد عبدالرحمٰن بن ابی شریح المتوفی ۳۹۲ھ نے اپنی کتاب "الاحادیث المائۃ" میں اپنے شیخ ابو علی اسماعیل الوراق البغدادی المتوفی ۳۲۳ھ سے (یہ کتاب بھی بحمدہٖ میرے یہاں محفوظ ہے) اور ابوالحسن علی بن غنائم خرقی المالکی نے فوائد کے جزوِ اوّل میں درج کیا ہے۔ (یہ کتاب بھی بحمدہٖ میرے کتب خانہ میں موجود ہے)۔

۱۲۔ یہ شرط ہے کہ جب بھی حضورؐ پر صلوات پڑھی جائے آل کو ضرور شامل کیا جائے۔

دونوں میں کوئی تفرقہ نہ ڈالا جائے چاہے وہ نماز کی حالت ہو یا کوئی دوسرا موقع ـــــ صحاح وسنن ومسانید میں کعب بن عجرہ وغیرہ کے طریق سے وہ طریقۂ صلوات بھی نقل ہوا ہے جو حضورِ اکرمؐ نے اپنے صحابۂ کرام کو تعلیم دیا تھا، جس میں اپنے ساتھ آلؑ کو بھی شامل کیا تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ شریعتِ اسلام میں جتنی حدیثیں آلؑ پر صلوات کے بارے میں وارد ہوئی ہیں شاید ہی کسی موضوع پر وارد ہوئی ہوں۔ بعض علمارِ اعلام نے صلوات کے تمام کیفیات کو جمع کر کے پچاس صورتوں تک پہنچایا ہے اور اتفاق سے ان میں ۴۶ صورتیں ایسی ہیں جن میں ہر فصل میں حضورؐ کے ساتھ آلؑ کا بھی ذکر ہے۔

اس کے علاوہ حضرتؐ نے ناقص صلوات سے منع بھی فرمایا ہے۔ چنانچہ روایت ہے کہ آپ نے ناقص صلوات سے ممانعت فرمائی تو اصحاب نے پوچھا کہ یہ ناقص صلوات کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ تم لوگ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ کہہ کر رُک جاتے ہو، یہ غلط طریقہ ہے۔ آئندہ سے یوں کہا کرو اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ۔ افسوس یہ ہے کہ امّتِ اسلامیہ میں ہر موقع پر ناقص صلوات کا رواج ہو گیا ہے۔ وہ نماز ہو یا خطبہ، تصنیف ہو یا تالیف۔ شریعت میں تقریباً پچاس سے زیادہ مقامات ایسے ہیں جہاں صلوات پڑھنا مستحب ہے اور مسلمان ہر مقام پر "صلی اللہ علیہ وسلم" کا استعمال کرتے ہیں۔ حقیقتاً یہ ایک ایسی منحوس بدعت ہے جو سراسر سنّتِ رسولؐ، نصِ حضرتؐ اور تعلیمِ اصحاب کے خلاف ہے۔ حضرتؐ نے اس قدر تاکید فرمائی تھی کہ صحیح طریقہ اُمّت میں رائج ہو جائے اور اُمّت نے سب کو نظر انداز کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رسولِ اعظمؐ کا کلام کوئی مہمل کلام تھا، اُس کا درجہ وَحْیٌ یُّوْحٰی کا نہیں تھا۔ درحقیقت یہی چلن اُمّت کی ہلاکت وتباہی کا پتہ دیتا ہے۔

قیامت یہ ہے کہ اس مخالفتِ پیغمبرؐ پر اُمّت کو اصرار بھی ہے اور اسی کو اُمّت نے اسلامی دستور سمجھ لیا ہے۔ خدا جانے اُمّت کے اس طرزِ عمل سے روحِ رسالتؐ کو کس قدر اذیت ہوتی ہوگی۔

۱۳۔ محبتِ اہلبیتؑ جملہ اعمال وعبادات، صلوات وطاعات، حج وصیام وغیرہ میں شرط کی حیثیت رکھتی ہے، جیسا کہ اکثر احادیث میں وارد ہوا ہے اور ہم نے ان احادیث

کو "الغدیر" کی جلد ثانی میں جمع بھی کر دیا ہے۔

۱۴۔ خدا اور رسولؐ نے قرآن و سنّت میں ان کی اس قدر مدح فرمائی ہے جس کا کوئی جواب نہیں ہے۔ ان کے فضائل و مناقب ہزاروں سے اوپر ہیں، بلکہ بقول ابن عباس تیس ہزار کے قریب ہیں۔

۱۵۔ اہلبیتؑ میں ذاتی طور پر محبّت کے جملہ اسباب و عوامل پائے جاتے ہیں۔ یہ اصل و نسل کے طاہر، حسب و نسب کے طیّب۔ حکمت و علم کے مخزن، زہد و ورع و تقویٰ کے خوگر اور فضائل و کمالات کے مرکز ہیں۔ ان کے کمالات کی کوئی حد نہیں ہے۔ لہٰذا ان کی محبّت بھی لامحدود ہو گی۔

مذکورہ بالا عوامل و اسباب کے علاوہ ایسے بے شمار اسباب ہیں جن میں سے ہر سبب تن تنہا ایک مستقل محبّت کا داعی ہے جو دلوں میں گھر بھی کر لیتا ہے اور نفوس کو اپنی طرف متوجہ بھی کر لیتا ہے اور ان سب سے بالاتر یہ ہے کہ اہلبیت اطہار اہل ارض کے لئے ہر اختلاف اور تباہی سے نجات کا ذریعہ ہیں۔ نوعِ بشر کے جملہ طبقات ان کے پرچم امن و امان کے زیر سایہ زندگی گذار سکتے ہیں۔ ان کا کرم عام، ان کا ابرِ رحمت محیط، ان کے برکاتِ حیات غیر محدود۔ یہ سببِ بقاءِ ارض و سماء اور وجہِ رزقِ اہل ورٰی ہیں۔ یہ نہ رہیں تو دنیا تباہ و برباد ہو جائے اور قیامت نازل ہو جائے۔

دعوتِ مطالعہ:

✱ حفاظ احادیث مسدد، ابن ابی شیبہ، ابو احمد الفرضی، ابو عمرو بن ابی عزرہ، ابو یعلی الموصلی، ابو القاسم الطبرانی، الحکیم الترمذی، المحب الطبری، ابن عساکر وغیرہ نے سلمہ بن الاکوع کے طریق سے مرفوعاً روایت کی ہے کہ ستارے اہلِ آسمان کے لئے وجہِ امان ہیں اور میرے اہلبیتؑ میری اُمّت کے لئے۔"

علامہ عزیزی نے سراج ۳ ص ۱۴۶ میں اس روایت کی یوں شرح کی ہے کہ "یہاں اہلبیتؑ سے مراد علماءِ اہلبیت ہیں اور ممکن ہے کہ سارے گھر والے مراد ہوں اس لئے

کہ جب ساری کائنات پیغمبرؐ کے طفیل میں خلق ہوئی ہے تو اس کی بقا بھی بقائے اہلبیتؑ سے وابستہ ہوگی۔"

علاّمہ حفنی کہتے ہیں کہ "اہلبیتؑ سے مراد ذرّیتِ رسول ہے۔ انھیں کے ذریعہ سے اُمّت سے بلائیں دفع ہوتی رہتی ہیں۔"

★ امام الحنابلہ احمد نے اپنے اسناد سے انس بن مالک کے طریق سے مرفوعاً نقل کیا ہے کہ "ستارے اہلِ سمار کے لئے امان ہیں اور میرے اہلبیتؑ اہلِ ارض کے لئے۔ اگر اہلبیتؑ نہ رہ جائیں تو وہ علامتیں ظاہر ہوجائیں جن کا وعدہ کیا گیا ہے۔"

اس نقل کے بعد آپ نے اس طرح شرح فرمائی ہے کہ اللہ نے زمین کو پیغمبرؐ کی وجہ سے خلق کیا ہے اس لئے اس کا دوام بھی بقائے اہلبیتؑ سے وابستہ ہے۔

★ احمد ہی نے حضرت علیؑ کے طریق سے مرفوعاً نقل کیا ہے کہ "نجوم امانِ اہلِ سمار ہیں اور اہلبیتؑ امانِ اہلِ ارض۔ اہلبیتؑ نہ رہیں تو اہلِ زمین بھی نہ رہ جائیں۔"

★ حاکم نے ابن عباس کے طریق سے مرفوعاً نقل کیا ہے کہ "نجوم اہلِ ارض کے لئے ڈوبنے سے امان ہیں اور اہلبیتؑ میری اُمّت کے لئے اختلاف سے امان ہیں۔"

حاکم نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے اور بہت سے علمار نے ان کے حوالہ سے حدیث نقل کرکے اس کی صحت کا اعتراف کیا ہے۔ علامہ صبان نے اسعاف میں روایت کو ذکر کرنے کے بعد اس کی یہ توجیہ کی ہے کہ یہ آیت قرآنیہ کا مفہوم ہے۔ "اللہ اُس وقت تک عذاب نہیں کرسکتا جب تک اے رسولؐ آپ ان کے درمیان رہیں گے۔" یعنی اہلبیتِ رسولؐ قائم مقام رسولؐ ہیں۔ وہ رسولؐ سے ہیں اور رسولؐ ان سے ہیں۔

علاّمہ ابن حجر نے صواعق میں اس آیت کو اہلبیتؑ کی شان میں نازل ہونے والی آیات میں شمار کیا ہے اور حوالے میں اسی حدیث شریف کا ذکر کیا ہے۔

★ حاکم ہی نے ابو موسیٰ اشعری کے طریق سے مرفوعاً نقل کیا ہے کہ ستارے امانِ اہلِ سمار ہیں اور اہلبیتؑ امانِ اہلِ ارض۔ ستارے نہ رہیں تو اہلِ سمار نہ رہیں اور اہلبیتؑ نہ رہیں تو اہلِ ارض تباہ ہوجائیں۔

٭ حاکم ہی نے اس روایت کو ان الفاظ میں بھی نقل کیا ہے "ستارے امانِ اہلِ سماء ہیں کہ ستارے نہ رہیں تو قیامت آجائے۔ میں امانِ اصحاب ہوں۔ میں نہ رہوں گا تو قیامت برپا ہوجائے گی۔ میرے اہلبیتؑ امانِ اُمّت ہیں۔ وہ نہ رہیں گے تو محشر بپا ہوجائے گا۔"

٭ شیخ الاسلام حموینی نے ابوسعید خدری کے طریق سے مرفوعاً نقل کیا ہے کہ "اہلبیتؑ امانِ اہلِ ارض ہیں جس طرح ستارے امانِ اہلِ سماء ہیں۔"

حافظ ابن حجر نے صواعق میں حدیثِ سفینہ کے ذیل میں لکھا ہے کہ ممکن ہے کہ اہلبیتؑ سے مراد ان کے علماء ہوں اس لئے کہ انھیں کی وجہ سے ہدایت حاصل کی جاسکتی ہے جس طرح ستاروں سے رہنمائی حاصل ہوتی ہے اور یہی حضرات وہ ہیں کہ جن کے نہ رہنے سے قیامت کے امکانات ہیں جیسا کہ روایات میں ہے کہ جب حضرت مہدیؑ کا ظہور ہوگا تو عیسیٰؑ آپ کے پیچھے نماز پڑھیں گے ــــ دجال قتل کیا جائے گا اور علاماتِ قیامت ظاہر ہوجائیں گی ــــ دوسرا احتمال جو زیادہ قوی ہے یہ ہے کہ اہلبیتؑ سے مراد تمام افراد ہوں اس لئے کہ جب پروردگار نے ساری دنیا کو نبیؐ کے طفیل میں پیدا کیا ہے تو کیا بعید ہے اگر بقائے دنیا بقائے آلؑ سے وابستہ ہو، اس لئے کہ اہلبیت بہت سی باتوں میں نبیؐ سے یکسانیت رکھتے ہیں جیسا کہ امام رازی سے نقل کیا گیا ہے ــــ اور خود حضورؐ نے ان حضرات کے حق میں فرمایا ہے کہ "خدا گواہ ہے یہ سب مجھ سے ہیں اور میں ان سے ہوں۔ یہ میرے پارۂ دل ہیں اس لئے کہ ان کی ماں فاطمہؑ پارۂ دلِ پیغمبرؐ ہیں۔

شاید امیر المومنین حضرت علیؑ نے بھی نہج البلاغہ میں انھیں معنوں کی طرف اشارہ فرمایا تھا۔ "ہم اللہ کے منتخب بندے ہیں۔ ہمیں اس نے بلند کیا ہے اور باقی لوگ ہمارے بلند کئے ہوئے ہیں۔" جیسا کہ ابن ابی الحدید نے ۳ ص ۴۵۱ پر تحریر فرمایا ہے کہ یہ کلام تمام کلاموں سے بالاتر اور یہ مفہوم تمام مفاہیم سے اجل و ارفع ہے۔ مقصد حضرت کا یہ ہے کہ دنیا کے کسی انسان کا ہمارے اوپر کوئی احسان نہیں ہے۔ اللہ نے ہمارے اوپر بلاواسطہ نعمتیں نازل کی ہیں لیکن باقی لوگ سب ہمارے شرمندۂ احسان ہیں۔ سب کو ہمارے طفیل میں نعمتیں ملی ہیں جو انتہائی بلند مقام اور اعلیٰ منزل ہے اور جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم اللہ

کے بندے ہیں اور ساری دنیا ہماری غلامی میں ہے۔"

اسی مفہوم کا استفادہ عمر بن الخطاب کے اس کلام سے بھی ہوتا ہے جس میں انھوں نے امام حسینؑ سے خطاب کر کے کہا تھا۔ "کیا اس سر پر تمھارے علاوہ کسی اور نے بال اُگائے ہیں"۔ یا بالفاظ دار قطنی "کیا اس سر پر اللہ کے بعد تمھارے علاوہ کسی اور نے بال اُگائے ہیں"۔ یا بقول ابن سعد "کیا ہمارے سروں پر تمھارے علاوہ کسی اور نے بال اگائے ہیں"۔ یا بالفاظِ دیگر "ہمارے سروں پر بال اُگانے والا پہلے خدا ہے اُس کے بعد تم"۔ (اس روایت کو ابن سعد، دار قطنی، ابن عساکر، حافظ گنجی وغیرہ نے نقل کیا ہے اور ابن حجر نے اصابہ ۲ ص ۱۵ پر اس کے اسناد کی تصحیح کی ہے۔)

ظاہر ہے کہ اگر اہلبیتؑ میں اس کے علاوہ کوئی اور خصوصیت نہ بھی ہوتی تو یہ خصوصیت تن تنہا محبّت کے لئے کافی تھی۔ یہ تو پوری زندگی اور اس پر مرتب ہونے والے اثرات سے بالاتر ہے۔ اسی کی بنا پر انھیں تمام مومنین کے نفوس سے اولیٰ قرار دیا گیا ہے اور اسی کی وجہ سے انھیں اہل وعیال، مال و منال سے زیادہ محبوب مانا گیا ہے اور یہی راز تھا کہ قدرت نے بھی اعلانِ ولایت میں اپنی اور اپنے رسولؐ کی ولایت عامہ کے ساتھ حضرت علیؑ کی ولایت کو شامل کر لیا ہے جیسا کہ تمام مفسّرین نے بالاتفاق اعلان کیا ہے۔ (الغدیر ۳ ص ۱۵۶۔ ۱۶۳)

نتیجۂ کلام:

اہلبیتِ اطہارؑ کی سیرت وحیات میں محبّت کے جملہ اسباب وعوامل پر نظر کرنے کے بعد یہ فیصلہ آسان ہو جاتا ہے کہ ہماری محبّت ان اسباب سے کہیں زیادہ کم ہے اور ہماری اطلاع ان صفات وکمالات کی حقیقت و واقعیت سے ہزاروں میل دور ہے۔ کہاں ہم اور کہاں ان کے صفات وکمالات کی حقیقت؟ وہ 'وہ' ہیں اور ہم، ہم ۔۔۔! ایک جاہل اُمّی سے کہاں ممکن ہے کہ وہ علم اور اس کی حقیقت و واقعیت، اس کا آغاز و انجام، اس کے اصول و فروع، اس کے اصناف و طرق، اس کے مناہج و مباحث، اس کے موضوعات و

فنون، اس کے اقسام و آثار، اس کی تکوین و تشریع، اس کے کم و کیف، اس کے طول و عرض، اس کی حدود مقدار، اس کے ماضی و حال و استقبال، اس کے عالم ملک و ملکوت کا اندازہ کرکے اس مقدّس شخصیت کے علم کا پتہ لگائے جو "مَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتَابِ" کی مصداق ہو، جس کے علم کا منتہیٰ اُمّ الکتاب، جس کے علم کا منبع وحی مبین، جس کے علم کا سرچشمہ عین الیقین، جس کے علم کا مرکز دہ واقع حقیقی ہو، جس میں وہم و شک، ظن و خیال کا گذر نہ ہو، جس سے مَلَک ہم کلام ہوتا ہو، جس کے قلب و دماغ پر علوم کا الہام ہوتا ہو جو وہ ہو جو ہے!

یہ تو اہلبیتؑ کے علم کا حال ہے۔ اب اسی پر باقی صفات و کمالات کا قیاس کیجئے۔ اس کے بعد فیصلہ کیجئے کہ ان سے کس قدر محبّت ہونی چاہئے۔ حقیقتِ امر یہ ہے کہ ہم کیا ہیں، مادرِ گیتی نے بھی کوئی ایسا انسان نہیں دیکھا جو ان کے کمالات کے تمام جہات کا احاطہ کر سکے اور ان تمام فضائل کا احصار کر سکے جو پروردگارِ عالم نے انھیں عنایت کئے ہیں۔ یہ کمالات وہ ہیں جو محبّت کے داعی، ولایت کے اسباب، خلافت کے عوامل، امامت کے موجبات ہیں۔ اور جب ایک ایک صفت کی جہت کا احاطہ ناممکن ہے تو تمام اوصاف و جہات کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے جن کی تعداد دہائیوں سے گذر کر سیکڑوں تک پہنچ جاتی ہے۔ اور جب اوصاف کے بارے میں فیصلہ ناممکن ہے تو محبّت کے کسی بھی درجہ کو غلو سے تعبیر کرنا ناانصافی ہے اس لئے کہ غلو حد سے تجاوز کرنے کا نام ہے اور اہلبیتؑ کے فضائل کی کوئی حد معیّن نہیں ہے۔ ان کے علم و ارادہ و قدرت و تصرّف و رضا و غضب و حلم و عفو و رحمت و فضل و کرم کی کسی قدر بھی تعریف کیوں نہ کی جائے اور اپنی نظر میں کتنے ہی مبالغہ سے کام کیوں نہ لیا جائے بہر حال وہ تعریف حدودِ امکان کے اندر رہے گی اور اس کا صفات واجب سے کوئی موازنہ و مقابلہ ممکن نہ ہوگا اور جب دونوں میں موازنہ ناممکن ہے تو شرک کا بھی کوئی امکان نہیں ہے اور سوال یہ ہے کہ موازنہ ہو بھی تو کیسے ہو۔ اس کے صفات ذاتی و مطلق ہیں اور ان کے صفات عرضی و محدود ـــــ اس کے اوصاف میں کیسے اور کہاں کا گذر نہیں ہے

اور ان کے اوصاف کَیفَ و اَینَ سے مقید ہیں۔ اس کے کمالات اصلی و استقلالی ہیں اور ان کے کمالات تبعی و غیری ـــــ اس کی ذات ازلی و ابدی ہے اور ان کی ذات حادث و متغیر ـــــ اور ان تفرقوں کے ہوتے ہوئے شرک کا تصوّر محال ہے۔

یہاں غلو کی دو ہی صورتیں ممکن ہیں، یا تو تفویض کا قائل ہو کر یہ فرض کر لیا جائے کہ پروردگار نے خدائی انھیں کے سپرد کر دی ہے اور خود معطّل ہو گیا ہے یا انھیں امکان کے حدود سے نکال کر واجب الوجود قرار دے دیا جائے اور ظاہر ہے کہ ایسا کچھ نہیں ہوتا ہے لہٰذا ہر درجہ محبّت جائز اور ہر منزل مُوَدّت مستحسن ہے۔ محبّتِ اہلبیتؑ میں ہمارا طرزِ عمل مو بہ مو رسولِ اعظمؐ کے طرزِ عمل سے ملتا جلتا ہے۔ یہی عقل کا فیصلہ اور منطق کا حکم ہے۔ یہاں غلو و افراط کا گذر نہیں ہے البتہ تفریط و کوتاہی کا امکان ہے۔

حسینؑ ــــ عزاداری ــــ کربلا

اُمّتِ اسلامیہ کا مسلّمہ مسئلہ ہے کہ رسولِ اکرمؐ خاتم النبیین ہونے کے اعتبار سے جملہ آنے والے واقعات سے مطلع اور باخبر تھے۔ آپ کو ان تمام مصائب و آلام حوادث و شدائد کا بھی علم تھا جن سے آپؐ کی عترت و اولاد' ذریت و نسل دوچار ہونے والی تھی۔ آپ کے سامنے قیامت خیز مصائب' شدت انگیز مظالم' بلاخیز حوادث بہتے ہوئے خون' تڑپتے ہوئے لاشے' سب کچھ تھے لیکن جہاں ولایتِ مطلقہ کی بنا پر آپ ان تمام حوادث سے باخبر تھے' وہاں ولایتِ عامہ ہی کی بنا پر آپ کا یہ فرض بھی تھا کہ اپنے علم پر آثار مرتب نہ کریں' مظالم پر صبر کے پردے ڈال دیں' رجال ظلم و جور سے مواخذہ نہ کریں' قبل از وقوع واقعہ قصاص نہ لیں' ظلم سے پہلے حد جاری نہ کریں' باغی جماعت سے قطع تعلق نہ فرمائیں' ظالم گروہ سے ترک موالات نہ کریں' مستقبل کے جنایت کاروں کو اپنے دربار سے جدا نہ کریں' ظاہر ہے کہ اس علم کے ساتھ یہ طرزِ عمل صاحب ولایتِ مطلقہ کے علاوہ کسی انسان میں قابل احتجاج نہیں ہے۔ یہ موضوع اگرچہ تفصیل طلب ہے لیکن ہم صرف اس لئے ترک کئے دیتے ہیں کہ اس کا یہ موقع نہیں ہے۔ امتِ اسلامیہ کا بہر حال یہ عقیدہ ہے کہ نگاہ رسالتؐ کے سامنے وہ تمام آفات و بلیات' مصائب و آلام موجود تھے اور آپؐ اپنے اہلبیتؑ پر ہونے والے مظالم کا مشاہدہ کر رہے تھے۔ کبھی اپنی پارۂ جگر پر ٹوٹنے والے پہاڑوں کو دیکھتے تھے' کبھی اپنے بھائی پر ہونے والے مظالم کو' کبھی اپنی ذریت کی تباہی کا مشاہدہ کرتے تھے۔ کبھی اپنے گھر کی بربادی کا ــ اور یہی وجہ تھی کہ آپ ہمیشہ محزون رہا کرتے تھے اور آپؐ کی زندگی حزن و الم کا شکار ہو گئی تھی۔ مسرت کے آثار آپؐ کے چہرے سے غائب ہو گئے تھے اور غم و غصہ کے مظاہر ہمیشہ نمایاں رہتے تھے۔

ہاں اگر کبھی تسکینِ قلب کے لئے ساز گار ماحول مل جاتا تھا تو اپنے دل کی آگ بجھانے کے لئے اور رنج والم کا مداوا کرنے کے لئے اپنے بچوں کو سینے سے لگا لیا کرتے تھے، ان کی خوشبو سونگھتے تھے، انھیں بوسے دیا کرتے تھے اور ساتھ ساتھ دور اندیشی کی بنیاد پر آنسو بھی بہایا کرتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ زبان پر تسلّی آمیز فقرے ہوتے تھے۔ کبھی سید العترة ابوالحسین علیؑ کو سرِ راہ گلے سے لگا کر ان کو بوسے دیتے تھے اور فرماتے تھے۔ "میرے ماں باپ فدا ہو جائیں اس مظلوم پر جو تنہا شہید ہوگا" جیسا کہ حافظ ابو یعلیٰ موصلی نے اپنی مسند میں امّ المومنین عائشہ سے روایت کی ہے اور اکثر اعلام حدیث نے نقل کیا ہے۔

حفاظِ احادیث نے ابن عبّاس سے نقل کیا ہے کہ "ایک دن میں پیغمبرِ اسلام اور علیؑ مرتضیٰ کے ساتھ مدینہ کے باغات کی طرف گیا۔ راستہ میں ایک باغ کے پاس سے گذر ہوا تو حضرت علیؑ نے فرمایا یا رسولؐ اللہ، یہ باغ کس قدر خوبصورت اور حسین ہے۔ تو آپؐ نے فرمایا کہ جنّت میں تمھارا باغ اس سے زیادہ حسین ہوگا۔ اس کے بعد اپنے ہاتھوں سے حضرت کے سر اور ریشِ مبارک کی طرف اشارہ کر کے رونے لگے؛ کسی نے پوچھا یا رسولؐ اللہ، یہ رونے کا کیا محل ہے؟ فرمایا کہ لوگوں کے دلوں میں کینے چھپے ہوئے ہیں جو میرے بعد ظاہر ہوں گے۔"

انس بن مالک کے الفاظ میں۔ "پیغمبرؐ نے علیؑ کے شانے پر ہاتھ رکھا اور رونے لگے۔ انھوں نے دریافت کیا یا حضرت یہ رونے کا کیا محل ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا کہ قوم کے سینوں میں کینے چھپے ہوئے ہیں جو میری ذات کے بعد ظاہر ہوں گے۔"

امیر المومنینؑ کے الفاظ میں۔ "جب راستے میں تنہائی ملی تو حضرتؐ نے مجھے گلے سے لگایا اور اس زور سے روئے کہ ہچکی بندھ گئی۔ میں نے عرض کی یا حضرت یہ آپ کیوں رو رہے ہیں؟ تو فرمایا کہ لوگوں کے دلوں میں تمھاری طرف سے کینے ہیں جو میرے بعد ظاہر ہوں گے۔"

(مسند بزار، معجم کبیر طبرانی، مسند ابو یعلیٰ، تاریخ ابن عساکر، مجمع، ہیثمی)

کبھی کبھی علیؑ کو تسکین و تسلّی دینے کے لئے یہ پوچھا کرتے تھے کہ اس وقت کس طرح صبر کرو گے جب تمھاری ریش تمھارے سر کے خون سے خضاب ہوگی؟ اور وہ یہ جواب

دیتے تھے کہ یہ موقع صبر کا نہیں ہے، یہ شکر اور مسرّت کا مقام ہے تو علیؑ کی بلندئ نفس اور جذبۂ قربانی کو دیکھ کر مطمئن ہو جایا کرتے تھے۔ (معجم کبیر طبرانی)

کبھی اپنے فرزند حسنؑ کو گلے سے لگا کر ناف سے منھ تک کے بوسے لیا کرتے تھے اس لئے کہ آپ کے پیشِ نظر وہ منظر بھی تھا جب جگر کے ٹکڑے منھ سے گرنے والے تھے۔

کبھی اپنے لال حسینؑ کو گلے لگا کر اُن جگہوں کے بوسے لیتے تھے جو تیر و تلوار، خنجر و نیزہ سے زخمی ہونے والے تھے ـــ اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً حسینؑ کا ماتم بھی کیا کرتے تھے اور امہات المومنین کے گھروں میں بیٹھ کر ذکر مصائب پر آنسو بھی بہایا کرتے تھے اور جب حزن و الم زیادہ ہو جاتا تھا تو حسینؑ کو گودی میں لے کر اصحاب کے مجمع میں تشریف لاتے تھے اور شدّت سے گریہ فرما کر کہا کرتے تھے۔ یہ میرا حسینؑ ہے جسے میری اُمّت قتل کرے گی، اور یہ میرے ہاتھوں میں خاکِ کربلا ہے ـــ کبھی خاکِ کربلا ہی کو لے کر سونگھتے تھے اور رو رو کر فرماتے تھے۔ اس خاک سے کرب و بلا کی بو آتی ہے ـــ آہ کرب و بلا ـــ کربلا ـــ ارض کرب و بلا ـــ خدا کی قسم مجھے بڑا رنج ہوتا ہے ـــ ہائے کون میرے حسینؑ کو قتل کرے گا ـــ کاش میرے پیشِ نظر وہ شخص ہوتا جو حسینؑ کو میرے بعد قتل کرے گا۔

خود صدیقہ طاہرہؑ کو دیکھئے کہ جب پیغمبرِ اسلام نے انھیں سب سے پہلے اپنے پاس پہنچنے کی خبر سُنائی تو مُسکرا دیں اور محظوظ ہوئیں۔ (مسند احمد، مسند ابو یعلیٰ، مصنف ابن ابی شیبہ، خصائص نسائی، صحیح ترمذی، کتاب ابو الحسن حربی، مشکل الآثار طحاوی، علل دار قطنی، حلیۃ الاولیاء ابو نعیم، دلائل بیہقی وغیرہ، از ام المومنین عائشہ۔)

ظاہر ہے کہ اس کا کوئی سبب نہیں ہو سکتا سوائے اس کے کہ آپ کے پیشِ نظر آلِ محمدؐ کی وہ زندگی تھی جس میں مصائب و آلام، شدائد و آفات کے علاوہ کچھ نہ تھا ورنہ اگر ان مصائب و مظالم کا تصوّر دامن گیر نہ ہوتا تو کیا وجہ تھی کہ صدیقہ طاہرہؑ اپنی زندگی سے بیزار ہوتیں جب کہ وہ زندگی بہترین، پاکیزہ، قابلِ فخر اور باسعادت تھی۔ ان کے سر پر ایسا شوہر تھا جو فضائل و کمالات میں ان کے پدرِ بزرگوار جیسا تھا اور ان کی آغوشِ تربیت میں حسنؑ و حسینؑ جیسے فرزند تھے جو جوانانِ اہلِ جنّت کے سردار

تھے جن کی تعریف میں زبانیں گنگ ہیں، اور عقیلہ زینبؑ جیسی دختر جو قدس و کمال و شرف عفّت کا جوہر تھیں۔ ایسے حالات میں زندگی سے بیزار ہونے کے کیا معنی ہیں جب کہ ابھی آپ عنفوانِ شباب کی منزل میں تھیں، زندگی کی امیدیں پوری بھی نہ ہو سکی تھیں؟

آخر یہ تعجیلِ وفات کی دعائیں کیوں ہو رہی ہیں۔ ابھی تو آپ نے اولاد کے وہ دن بھی نہیں دیکھے جو مائیں دیکھنے کی متمنّی رہتی ہیں اور جن کے سامنے دنیا کی ہر مصیبت سبک ہو جاتی ہے، ہر تلخی شیرینی سے بدل جاتی ہے اور ہر جدید و قدیم دولت قربان کر دی جاتی ہے۔

آخر آپ اپنے بچوں کی پرورش سے کیوں ہاتھ اٹھائے لے رہی ہیں۔ اپنی گودی کو ان سے کیوں خالی کرنا چاہتی ہیں۔ ان کی یتیمی پر کیوں رضامند ہو گئی ہیں؟ یہ تو ابھی کم سن ہیں۔ آخر آپ اپنے پھولوں کی پژمردگی کو کیوں برداشت کر رہی ہیں؟ یہ تو ابھی تر و تازہ ہیں اور آپ نے ان کی خوشبو تک نہیں سونگھی ہے۔ ابھی تو یہ منھ بند کلیاں ہیں۔ ان کی شادابی کا وقت بھی نہیں آیا ہے۔ آخر آپ اپنے رفیقِ حیات کا فراق کیوں گوارا کر رہی ہیں اور انھیں رنج والم وغم کا رفیق بنا کر کیوں چھوڑے جا رہی ہیں۔ جب کہ ان کا رنج دائمی اور ان کی رات بیداری کی ہو جائے گی۔

آخر یہ خبرِ وفات اور قربتِ موت سے مسرّت کیسی ہے؟

کیا ان تمام باتوں کی کوئی اور توجیہ ممکن ہے سوائے اس کے کہ آپ اپنے پدر بزرگوار سے ان تمام مصائب کا حال سُن چکی تھیں جو آپ کے گھر والوں پر پڑنے والے تھے اور آپ کی نظر میں ان کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا بجز اس کے کہ موت کی آغوش میں پناہ لے لی جائے اور اپنے پروردگار کے جوارِ رحمت کو بسا لیا جائے تا کہ اس زندگی کی تندی و تلخی سے نجات مل جائے۔

آخر صدیقہؑ زندہ بھی رہ کے کیا کرتیں جب کہ وہ اپنے پدر بزرگوار کی پوری زندگی رنج والم میں گھری ہوئی دیکھ رہی تھیں اور آپ کے پیشِ نظر وہ منظر بھی تھا جب آپ کے پدر بزرگوار نے دنیا کو چھوڑا تھا اور ان کی آنکھوں میں آنسو تھے، ان کا دل بے چین اور مضطرب تھا۔ ان کے

پہلوؤں میں اہلبیتؑ کے مصائب کا درد جاگزیں تھا اور وہ مسلسل اپنے فرزند حسینؑ کا ماتم کر رہے تھے۔ بلکہ حسین کی ولادت کے بعد سے پیغمبرؐ کا گھر عزاخانہ کی شکل میں تبدیل ہو گیا تھا۔ ملائکہ جوق در جوق آتے تھے اور حسینؑ کی سنائی سناتے تھے۔ کبھی سرخ خاک لے کر آتے تھے اور کہتے تھے، یہ مقتلِ حسینؑ کی خاک ہے۔

یہ اسلام کے تاریخی مواقف تھے جنھیں تاریخ کے دامن نے محفوظ کر لیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ حوادث اس سے کہیں زیادہ تھے لیکن جس قدر ہم تک پہنچے ہیں انھیں کا ایک خاکہ پیشِ خدمت ہے۔

ماتمِ میلاد

امام حسینؑ کی ولادت کی پہلی ساعت کا ماتم

حافظ احمد بن الحسین البیہقی کا بیان ہے کہ مجھے ابوالقاسم الحسن بن محمد المفسر نے اور انھیں ابوبکر محمد بن عبداللہ الحفید نے خبر دی ہے کہ ان سے ابوالقاسم عبداللہ بن احمد بن عامر طائی نے بصرہ میں اور ان سے ان کے والد نے، ان سے حضرت علیؑ بن موسیٰ نے، ان سے ان کے والد حضرت موسیٰؑ بن جعفرؑ نے، ان سے ان کے والد جعفرؑ بن محمدؑ نے، ان سے ان کے والد محمدؑ بن علیؑ نے، ان سے ان کے والد علیؑ بن الحسینؑ نے اور ان سے اسماء بنت عمیس نے بیان کیا ہے کہ آپ کی جدّہ ماجدہ کے یہاں جب امام حسن کی ولادت ہوئی ـــ (ایک تفصیل کے بعد) ـــ اور جب حسینؑ کی ولادت ہوئی تو حضورؐ میرے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ میرے فرزند کو لے آؤ۔ میں نے ایک پارچہ میں لپیٹ کر دیا۔ آپ نے داہنے کان میں اذان کہی اور بائیں کان میں اقامت کہی، اس کے بعد اپنی گودی میں بٹھا کر رونے لگے۔ میں نے عرض کی میرے ماں باپ فدا ـــ یہ رونے کا کون سا وقت ہے؟ فرمایا اپنے اس فرزند کو رو رہا ہوں۔ میں نے عرض کی کہ یہ تو ابھی پیدا ہوا ہے ـــ فرمایا اے اسماء! اسے ایک باغی جماعت قتل کرے گی، جس کی میں ہرگز شفاعت نہ کروں گا۔ اے اسماء! دیکھ فاطمہؑ کو اس کی خبر نہ کرنا اس لئے کہ وہ ابھی زچہ خانہ میں ہے.....!

حافظ ابوالموید خوارزمی نے اس روایت کو "مقتل الحسینؑ" ا ص ۸۷-۸۸ پر اپنے اسناد سے حافظ بیہقی سے نقل کیا ہے۔

حافظ محب الدین طبری نے ذخائر العقبیٰ ص ۱۱۹ بر مسند امام رضاؑ سے اور السید محمود شیخانی مدنی نے "الصراط السوی" میں محب طبری سے نقل کیا ہے۔ (یہ کتاب میرے

کتب خانہ میں موجود ہے۔)

(میں نے اپنی کتاب "الغدیر" میں مسند امام علیؑ کے ذیل میں مسند امام رضا اور اس کی اہمیت و عظمت کے بارے میں باتفصیل بحث کر کے جملہ علماء اسلام کے اقوال نقل کر دیئے ہیں۔) امینی (طاب ثراہ)

غالباً کائنات میں یہ پہلی مجلسِ عزا ہے جو خانۂ رسالتؐ میں امام حسینؑ کی ولادت کے موقع پر منعقد کی گئی ورنہ گوشِ دنیا میں ایسی کوئی آواز نہیں ہے کہ فرزندِ زہراؑ کے علاوہ کسی بچّے کی ولادت کے موقع پر جشنِ مسرّت کے بجائے مجلسِ عزا قائم ہوئی ہو۔

کائنات میں کسی بچّے کے بارے میں نہیں سُنا گیا کہ اس کے عرصۂ وجود میں قدم رکھتے ہی مبارکباد کے بجائے اس کی سنائی سنائی جائے اور اس کے قتل و مقتل کا ذکر کیا جائے۔

تاریخ نے آدمؑ سے خاتمؐ تک کسی ایسے فرزند کا پتہ نہیں بتایا کہ جس کے پدرِ بزرگوار کی خدمت میں مسرّت کے تحفوں کے عوض خاکِ تربت پیش کی جائے کہ حزن والم اس کے دل کی گہرائیوں میں جاگزیں ہو جائے اور اس کا دل رنج و غم کا مرکز بن جائے ـــــ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حسینؑ کا یوم ولادت خالقِ کائنات کی نظر میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے جس نے یہ واضح کر دیا کہ مقدر نے آلِ محمدؐ کے حق میں خوشی نہیں لکھی اور حسینؑ غم سے توأم حقیقت کا نام ہے۔ یہی وہ بات تھی جس نے آلِ محمدؐ کی زندگی کو وقفِ آلام کر دیا۔ ان کے گھروں سے مسرّت کی جڑیں اکھاڑ کر پھینک دیں اور ان کے گھروں کو بیت الاحزان بنا دیا۔

یہ سب اس وقت ہوا جب حضورؐ نے جبرئیل امینؑ سے شہادت کے موضوع پر باقاعدہ گفتگو فرمائی اور جبرئیلؑ حضرت احدیت کا پیغام لے کر آئے کہ یہ امر حتمی قابلِ ترمیم و تبدیل نہیں ہے جیسا کہ حافظ دار قطنی نے مسند میں اور ابن عساکر نے تاریخ شام میں نقل کیا ہے کہ جب جبرئیلؑ نے حضورؐ کو یہ خبر دی کہ آپ کی اُمت حسینؑ بن علیؑ کو شہید کر دے گی تو آپؐ نے فرمایا کہ کیا میں اس سلسلہ میں پروردگار سے درخواست کروں؟ جبرئیلؑ نے عرض کی نہیں ـــــ یہ امر حتمی ہو چکا ہے۔

پیغمبرِ اسلامؐ کی تمام تر خواہش یہ تھی کہ یہ خبر حسینؑ کی ماں سے مخفی رہے اس لئے کہ وہ ابھی ولادت کی ابتدائی منزلوں میں ہے اور ماں اپنے بچہ پر بیحد مہربان ہوتی ہے۔ اس میں مصائب کا مقابلہ کرنے کے لئے مرد جیسی طاقت نہیں ہوتی ہے۔ پھر بچہ بھی ابھی اس کے سینے سے لگا ہوا ہے، اس کی آغوش میں مچل رہا ہے۔ ایسے وقت میں مستقبل کا تصوّر کیسے برداشت ہوگا اور کس جذبہ کے تحت اس کی پرورش ہوگی ؟ کس امید پر اسے پالا جائے گا؟ کس سکونِ قلب اور اطمینانِ خاطر کی بنیاد پر اسے لوریاں دی جائیں گی ؟ کن الفاظ میں اس کا دل بہلایا جائے گا ؟ حالانکہ ماں کے لئے بچّے کو لوریاں دیا جانا ضروری ہے لہٰذا فاطمہؑ بھی لوریاں دیں گی ـــــ اور مادرِ حسینؑ کو حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے بچّے کو لوریاں دے کر سلائے، لیکن اس کی لوریاں کیا ہیں ؟

"واحسینا ! ـــــ واحسینا ! ـــــ واحسینا !"

یا وہ فقرات جو اس کے نانا استعمال کیا کرتے تھے :

"کربلا یا کربلا ـــــ کربلا لازلت کربًا و بلاءً"!

تو کیا حقیقتًا یہ بات فاطمہؑ سے پوشیدہ رہ سکتی تھی ـــــ ہرگز نہیں، ـــــ پیغمبرؐ لاکھ اسے راز میں رکھنا چاہیں اور فاطمہؑ کے مادری جذبات کا لحاظ فرمائیں لیکن بات چھپے کیوں کر؟ یہ ملائکہ جو روزانہ صبح و شام حسینؑ کی سنانی لے کر آرہے ہیں ـــــ یہ امہات المومنین کے گھروں میں مجلسِ عزا جو برپا ہو رہی ہے ـــــ یہ پیغمبرِ اسلامؐ، ازواج، اصحابِ کرام کی آنکھوں سے مسلسل آنسو جو بہہ رہے ہیں ـــــ یہ خاکِ کربلا جو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہو رہی ہے ـــــ یہ شیشے میں تربتِ حسینؑ جو ایک زندہ رمز کی طرح محفوظ کی گئی ہے ـــــ کیا ان تمام اسباب و علامات کے ہوتے ہوئے یہ راز راز رہ سکتا تھا ؟ ـــــ ہرگز نہیں !

(معلوم ہوا کہ پیغمبرِ اسلامؐ کی رازداری صرف مادری جذبات کے احترام کی بنا پر تھی، ورنہ فاطمہؑ تو خود عالمۂ غیر معلّمہ ہیں، ان پر کوئی بات کیوں کر راز رہ سکتی ہے ـــــ جوادی)

ماتمِ رضاعت

حافظ حاکم نیشاپوری نے مستدرک ۳ ص ۱۷۶ پر نقل کیا ہے کہ مجھے ابو عبداللہ محمد بن علی الجوہری نے بغداد میں خبر دی ہے کہ ان سے ابو الاحوص محمد بن الہیثم القاضی نے ــــ ان سے محمد بن مصعب نے، ان سے اوزاعی نے ــــ ان سے ابو عمار شدّاد بن عبداللہ نے اور ان سے ام الفضل بنت حارث نے روایت کی ہے کہ میں حضور اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور میں نے عرض کی کہ میں نے بڑا عجیب و غریب خواب دیکھا ہے ــــ آپ نے فرمایا وہ کیا ہے؟ میں نے عرض کی وہ خواب بڑا سخت ہے! فرمایا آخر ہے کیا؟ ــــ میں نے عرض کی کہ جیسے حضورؐ کے جسم کا کوئی ٹکڑا جدا ہو کر میری گود میں آگیا ہے ــــ فرمایا ام الفضل! یہ تو بڑا اچھا خواب ہے ــــ انشاء اللہ فاطمہ کے یہاں ایک فرزند متولّد ہوگا جو تمہاری آغوش میں رہے گا۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ فاطمہؑ کے یہاں حسینؑ کی ولادت ہوئی اور میری آغوش میں رہے، یہاں تک کہ میں ایک دن حضورؐ کی خدمت میں گئی اور میں نے بچّے کو آپ کی گود میں رکھ دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ حضورؐ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں ــــ میں نے عرض کی یا نبی اللہ میرے ماں باپ قربان! ــــ یہ کیا ہے؟ ــــ فرمایا ابھی جبرئیلؑ آئے ہیں اور انھوں نے خبر دی ہے کہ میری اُمّت میرے اس فرزند کو قتل کردے گی۔ میں نے عرض کی اس فرزند کو؟ ــــ فرمایا ہاں! ــــ اس کے بعد تھوڑی سی سُرخ مٹّی مجھے عطا فرمائی اور اسے علامتِ شہادت قرار دیا۔

حاکم نے اس روایت کو نقل کرنے کے بعد یہ نوٹ لگایا ہے کہ یہ امام بخاری و مسلم کے اصول کی بنا پر صحیح روایت ہے لیکن ان دونوں نے اسے نقل نہیں کیا ہے۔

حاکم نے ص ۱۷۹ پر نقل کیا ہے کہ مجھ سے ابو العباس محمد بن یعقوب نے ــــ ان سے محمد بن اسحاق صنعانی نے ــــ ان سے محمد بن اسماعیل بن ابی سمینہ نے، ان سے محمد بن مصعب، ان سے اوزاعی نے ابو عمار کے واسطہ سے اُمّ الفضل نے روایت کی ہے کہ حضور اکرمؐ نے مجھ سے اس وقت فرمایا کہ جب حسینؑ آپ کی آغوش میں تھے کہ جبرئیلؑ نے مجھے خبر دی ہے کہ میری اُمّت میرے حسینؑ کو شہید کر دے گی ــــ اس کے بعد حاکم نے تبصرہ کیا ہے کہ ابن ابی سمینہ نے اس حدیث کو مختصر کر دیا ہے ورنہ مکمل حدیث وہی ہے جسے دوسروں نے محمد بن مصعب سے نقل کیا ہے۔

حافظ بیہقی نے دلائل النبوۃ میں امام حسینؑ کے حالات میں حاکم سے دونوں طرح سے روایت کو نقل کیا ہے۔

حافظ ابن عساکر نے "تاریخ شام" میں سند عالی کے ساتھ حاکم سے پہلے الفاظ میں روایت درج کی ہے ــــ اور اس کے بعد ایک سند یہ بھی نقل کی ہے کہ مجھ سے ابو القاسم ابن السمرقندی نے، ان سے ابو الحسن ابن النقور نے ــــ ان سے ابو الحسن احمد بن محمد بن عمران المعروف بابن الجندی نے ــــ ان سے ابو روق احمد بن محمد بن بکر الہزانی نے، ان سے عباس بن فرج الہراتی (ریاشی) نے، ان سے محمد بن اسماعیل ابو سمینہ نے ــــ ان سے محمد بن مصعب نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ "ام الفضل نے حضرت سے عرض کی کہ یا رسولؐ اللہ میں نے ایک خواب دیکھا ہے جسے بیان کرتے ہوئے گھبراتی ہوں۔ آپؐ نے فرمایا کہ بیان کرو؟ ام الفضل کہتی ہیں کہ جیسے آپ کا کوئی ٹکڑا جُدا ہو کر میری گود میں آگیا ہے ــــ حضرت نے فرمایا سچ ہے، فاطمہؑ کے شکم میں جو بچہ ہے عنقریب عالم ظہور میں آئے گا۔ اس کا نام حسینؑ ہوگا اور وہ تمھاری گود میں رہے گا ــــ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ حسینؑ پیدا ہوئے، میری آغوشِ پرورش میں رہے۔ ایک دن حضرت تشریف لائے اور حسینؑ کو لے کر کھلانے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے ــــ میں نے عرض کی یا حضرت یہ رونے کا کیا سبب ہے؟ فرمایا یہ جبرئیلؑ مجھے خبر دے رہے ہیں کہ میری اُمّت میرے اس فرزند کو قتل کر دے گی"۔

رجالِ اسناد

۱۔ ابوعبداللہ محمد بن احمد بن علی بن مخلد البغدادی الجوہری الرئیس المعروف بابن المحرم المتوفی ۳۵۷ھ۔

۲۔ محمد بن الہیثم بن حماد بن واقد ابو عبداللہ ابو الاحوص قاضی عکبر البغدادی المتوفی ۲۷۹ھ ــــ ابن خراش کی نظر میں آپ عالم محتاط۔ دار قطنی کی نظر میں حافظ ثقہ و مامون۔ ابن حبان کی نگاہ میں ثقہ مستقیم الحدیث اور مسلمہ بن قاسم کے نزدیک ثقہ معتبر تھے۔

۳۔ محمد بن مصعب بن صدقہ ابو عبداللہ القرقسانی نزیل بغداد المتوفی ۲۰۸ھ۔ رجال ترمذی و ابن ماجہ میں شمار ہوتے ہیں۔ ابن قانع کے نزدیک ثقہ اور خطیب کے نزدیک حافظے سے حدیث بیان کرنے میں کافی غلطی کرتے تھے لیکن ان کا خیر و صلاح معروف ہے۔

۴۔ عبدالرحمٰن بن عمرو بن ابی عمرو ابو عمرو الاوزاعی الفقیہ المتوفی ۱۵۸ھ صحاح ستّہ کے رجال میں سے ہیں۔ دارمی، ابن معین نے توثیق کی ہے ــــ ابن سعد کا کہنا ہے کہ یہ ثقہ، مامون، صدوق، فاضل، خیّر، کثیر الحدیث والعلم والفقہ تھے۔ یعقوب بن شیبہ وغیرہ نے آپ کی توثیق کی ہے۔ بقول عجلی آپ شامی ثقہ اور خیار مسلمین میں سے تھے۔ بہت سے علماء نے تو آپ کو ائمہ میں شمار کیا ہے۔

۵۔ شدّاد بن عبداللہ القرشی ابو عمار دمشقی ــــ رجال صحاح ستّہ غیر از بخاری میں شمار ہوتے ہیں۔ عجلی، ابو حاتم، دار قطنی، یعقوب بن سفیان وغیرہ نے آپ کی توثیق کی ہے اور خود بخاری نے بھی الادب المفرد میں آپ کی حدیث نقل کی ہے۔

۶۔ ام الفضل لبابہ بنت الحارث اخت میمونہ ام المومنین ــــ صحابیہ تھیں اور صحاح ستّہ کے راویوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

۷۔ ابو العباس محمد بن یعقوب الاصم المتوفی ۳۴۶ھ آپ کی وثاقت و صداقت و صحت و سماعت میں کوئی اختلاف ہی نہیں ہے۔ دور دراز کے لوگ آپ کے پاس تحصیلِ حدیث کے لئے آیا کرتے تھے۔

۸۔ محمد بن اسحاق بن جعفر ـــــ ابوبکر صاغانی نزیل بغداد المتوفی ۲۷۰ھ ـــــ بخاری کے علاوہ تمام صحاح کے رجال میں ہیں ـــــ آپ کا شمار ان حافظوں میں ہوتا ہے جنھوں نے تحصیل حدیث کے لئے سفر کئے ہیں۔ ثقہ، ثبت، صدوق، مامون تھے۔ دین میں سخت، سُنّت میں مشہور، کثیر الروایۃ تھے۔ نسائی، ابن خراش، دارقطنی نے توثیق کرتے ہوئے لکھا ہے کہ آپ ثقہ بلکہ فوق الثقہ تھے۔

۹۔ محمد بن اسماعیل ابن ابی سمینہ ابوعبداللہ البصری المتوفی ۲۳۰ھ ـــــ حافظ ثقہ اور رجال بخاری و ابوداؤد میں تھے۔ ابوحاتم و صالح بن محمد نے آپ کی توثیق کی ہے اور ابن حبان نے ثقات میں شمار کیا ہے۔

۱۰۔ حافظ احمد بن الحسین بن علی ابوبکر البیہقی المتوفی ۴۵۸ھ ـــــ سبکی نے طبقات میں لکھا ہے کہ یہ ائمۃ المسلمین، ہداۃ المومنین اور دعاۃ الی حبل اللہ المتین میں تھے۔ فقیہ جلیل، حافظ کبیر، اصول کامل، زاہد ورع، عابد و ساجد، ناصر اصول و فروع، کوہِ علم و فضل وغیرہ تھے۔

۱۱۔ حافظ علی بن الحسن ابوالقاسم ابن عساکر دمشقی، شافعی المتوفی ۵۷۱ھ ـــــ ابن کثیر کے نزدیک اکابر حفاظ حدیث میں تھے۔ سماع و جمع و تصنیف و اطلاع و حفظ اسانید و اتقان فنون اسالیب میں قابلِ توجہ عامہ تھے ـــــ (اس کے علاوہ اور بھی کلمات تعریف پائے جاتے ہیں۔)

۱۲۔ ابوعبداللہ الفُرادی محمد بن الفضل بن الفضل بن احمد الشافعی الصاعدی نیشاپوری المتوفی ۵۳۰ھ۔ عالمِ خراسان اور فقیہِ حرم تھے اور مناظر بھی تھے ـــــ بقول ابن السمعانی ایسا شیخ الحدیث دیکھا ہی نہیں گیا ہے ـــــ حافظ ابن عساکر نے اپنے مشائخ میں شمار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میں نے نیشاپور میں کئی مرتبہ استفادہ کیا ہے۔

۱۳۔ حافظ ابوالقاسم اسماعیل بن احمد بن عمر السمرقندی المتوفی ۵۳۶ھ ـــــ ابن جوزی کے شیوخ میں تھے۔ المنتظم میں ہے کہ ان سے بہت سے شیوخ و حفاظ نے سماع کیا ہے۔ معرفتِ حدیث میں بیدار مغز تھے۔ میں نے ان سے بہت کچھ شیخ ابوالفضل ابن ناصر کی قراءت کے مطابق سنا ہے۔ ابوالعلاء ہمدانی تو یہاں تک کہا کرتے تھے کہ میں نے

خراسان و عراق میں ایسا کوئی شخص نہیں دیکھا ہے۔

۱۴۔ احمد بن محمد بن احمد بن عبداللہ ابوالحسن البزاز المعروف بابن النقور المتوفیٰ ۴۷۰ھ مشائخ حافظ بغدادی میں تھے۔ وہ ان کو صدوق سمجھتے تھے۔ ابن الجوزی کا بیان ہے کہ کثیر الحدیث صدوق، ثقہ اور روایات میں محقق و محتاط تھے۔ آپ کے حالات بکثرت کتب میں پائے جاتے ہیں۔

۱۵۔ ابوالحسن ابن الجندی احمد بن محمد بن عمران البغدادی المتوفیٰ ۳۹۶ھ ـــــ حافظ نے تاریخ بغداد میں آپ کے حالات لکھے ہیں اور عتیقی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ یہ متہم بہ تشیع ضرور تھے لیکن ان کے اصول بہت عمدہ ہیں۔

۱۶۔ ابوروق الہزانی احمد بن محمد بن بکیر البصری المتوفیٰ ۳۲۱ھ ـــــ ۹۰ سال سے زیادہ کی عمر پائی تھی۔

۱۷۔ ابوالفضل العباس بن الفرج الریاشی البصری ـــــ انھیں حبشیوں نے بصرہ میں قتل کر دیا تھا۔ اس وقت ۸۰ برس کی عمر تھی۔ ابوداؤد کے رجال میں ہیں خطیب، مسلمہ بن قاسم، ابن السمعانی، ابن العماد نے توثیق کی ہے۔ ابن حبان نے ثقات میں شمار کیا ہے اور مستقیم الحدیث قرار دیا ہے۔

بقیہ ماخذ:

مقتل خوارزمی ا ص ۱۵۸۔۱۵۹ نے اپنے اسناد سے حافظ بیہقی سے اور پھر حاکم مستدرک سے انھیں مذکورہ الفاظ میں نقل کیا ہے ـــــ پھر ص ۱۶۲ پر ان الفاظ میں لکھا ہے:

"جب میں نے حسینؑ کو رسولِ اکرمؐ کے پاس پیش کیا تو آپ نے ان کو لے لیا اور رونے لگے اور مجھے ان کی شہادت کی خبر دی ـــــ اس کے بعد جبرئیلؑ ملائکہ کا ایک گروہ لے کر آئے۔ سب کے پروبال پریشان۔ حسینؑ پر گریہ کناں۔ جبرئیل ہاتھ میں خاکِ تربتِ حسینؑ لئے ہوئے جس میں سے مشک کی خوشبو آ رہی تھی۔ خاک کو حضرت کے حوالے کیا اور عرض کی

یہ آپ کے فرزند حسینؑ کی تربت کی خاک ہے جسے ارضِ کربلا میں ملعون لوگ قتل کردیں گے پیغمبرؐ نے فرمایا، اے جبرئیلؑ کیا وہ امت بھی فلاح پاسکتی ہے جو میرے اور میری بیٹی کے لختِ دل کو قتل کردے؟ جبرئیلؑ نے عرض کی، ہرگز نہیں۔ ان پر اختلاف کی مار پڑے گی۔ ان کے دل و زبان میں ہمیشہ اختلاف رہے گا۔" (الفصول المہمہ ابن صباغ مالکی ص ۱۵۷، صواعق محرقہ ص ۱۱۵، خصائص کبریٰ ۲ ص ۱۲۵، کنز العمال ۶ ص ۲۲۳)

حالات رواۃ کے مآخذ :

تاریخ البخاری الکبیر ۲ ق ۲ ص ۲۲۷، ۳ ق ۱ ص ۳۳۶

الجرح والتعدیل ابن ابی حاتم ۲ ق ۱ ص ۳۲۹، ۲ ق ۲ ص ۲۶۶

تاریخ بغداد ۱ ص ۳۲۰، ۲ ص ۳، ۴۔ ۳ ص ۳۶۲، ۳۶۴، ۳۷۶۔ ۴ ص ۳۸۱۔ ۵ ص ۷۷، ۱۲ ص ۱۳۸، ۱۴۰

المنتظم ۵ ص ۵، ۷۸۔ ۶ ص ۳۸۹۔ ۷ ص ۴۵۔ ۸ ص ۳۱۴۔ ۱۰ ص ۶۵، ۹۸

اللباب ۱ ص ۴۸۴۔ ۲ ص ۲۵۶۔ ۳ ص ۲۹۰

تاریخ ابن خلکان ۱ ص ۲۴۶، ۳۶۳

کامل ابن کثیر ۵ ص ۳۶۴۔ ۱۰ ص ۲۰۔ ۱۱ ص ۱۷۷

معجم الادباء ۱۲ ص ۴۴۔ ۴۶

طبقات السبکی ۳ ص ۳۔ ۵، ۴ ص ۹۲۔ ۹۴، ۲۰۴۔ ۲۷۳۔ ۲۷۷

انباء الرواۃ ۲ ص ۲۶۷ (متن وحاشیہ)

الانساب سمعانی ص ۲۶۴

اخبار النحویین سیرانی ص ۸۹۔ ۹۳

تاریخ ابوالفداء ۲ ص ۴۸

تلخیص ابن مکتوم ص ۱۷۸

طبقات ابن شہبہ ۲ ص ۱۴۔ ۱۵

تاریخ ابن کثیر ۱۱ ص ۲۹۔۳۰۔۲۳۲، ۱۲ ص ۲۹۴
تذکرۃ الحفاظ ذہبی ۲ ص ۱۶۴، ۳ ص ۷۳۔۷۵
النجوم الزہراۃ ۳ ص ۲۷۔۲۸
نزہتہ الادبار ص ۲۶۲۔۲۶۴
طبقات الزبیدی ص ۶۷۔۶۹
تہذیب التہذیب ۴ ص ۳۱۷، ۵ ص ۱۲۴، ۶ ص ۲۳۸۔۲۴۲۔ ۹ ص ۳۵، ۲۷، ۵۹، ۴۵۸، ۴۹۸
بغیۃ الوعاۃ ص ۲۷۵۔۲۷۶
شذرات الذہب ۲ ص ۲۱، ۹۹، ۱۳۶، ۱۶۰، ۱۷۵، ۲۲۹۔ ۳ ص ۲۶، ۱۴۷، ۳۳۵۔ ۴ ص ۱۱۲

نوٹ: مستدرک میں امام حاکم نے ان روایات سے نقاب کشائی کی ہے جو امام بخاری و مسلم بن الحجاج کے شرائط کی بنیاد پر صحت کا درجہ رکھتی تھیں لیکن ان حضرات نے مصلحتِ وقت کا لحاظ کرتے ہوئے انھیں نظر انداز کر دیا ہے۔

مذکورہ بالا روایت کا عنوان "ماتمِ رضاعت" اس لئے ہے کہ یہ واقعۂ ولادت کے چند روز بعد پیش آیا ہے جب امام حسینؑ رضاعت کی منزلوں سے گذر رہے تھے۔

کتابوں کے حوالوں میں ۱ / ۲ سے مراد پہلی جلد اور دوسرا صفحہ ہے۔

ق سے مراد کتاب کی قسم ہوتی ہے۔ میں نے یہ اندازِ کتابت اپنی سہولت کے لیے اختیار کیا ہے جسے میں اپنی ہر تصنیف و تالیف و تحریر میں صرف کرتا ہوں۔ واللہ الموفق

رسولِ اکرمؐ اور جبرئیلؑ کی گفتگو کا یہ انداز صرف ظاہری قوانین کی بنا پر ہے ورنہ یہ حقائق حضورؐ پر روزِ روشن کی طرح واضح تھے۔ بھلا پیغمبرِ اسلام اور ان لوگوں کی نجات کے بارے میں سوچتے جو قاتلِ حسینؑ ہوں جب کہ زبانِ ملک سے انھیں "ملعون" جیسے لفظ سے یاد کیا ہے۔

جوادی

سالانہ ماتم

ولادت و وفات کے موقع پر تجدیدِ ذکر، اہم دینی یا قومی اقدامات کی یادگاریں۔ عالمی حوادث اور جماعتی انقلابات کی سالانہ یاد منانا۔ سال تمام ہونے پر خوشی کی مناسبتوں کو یومِ عید و مسرت اور غم کی تقریبات کو یومِ حزن والم قرار دینا وہ انسانی عادتیں ہیں جو عہدِ قدیم سے بطور میراث چلی آرہی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی جڑیں انسانی طبیعت میں پیوست ہیں اور اس کی بنیادیں ان صالح افکار پر قائم ہیں جو دورِ جاہلیت کے قبل سے آج تک کے انسانوں میں مشترک طور پر پائی جاتی ہیں۔

یہود و نصاریٰ اور عالم عربیت کے کارناموں کی یادگاریں تاریخ کے صفحات پر محفوظ ہیں جن سے محسوس ہوتا ہے کہ یادگار قائم کرنا ایک انسانی جذبہ ہے جس کی پُشت پر محبت و راقت جیسے عوامل کام کرتے ہیں اور جس کا سرچشمہ قومی زندگی سے ملتا ہے اس کی بنیادیں تعظیم و تکریم، احترام و اجلال جیسے اہم افکار پر قائم ہیں۔ یادگاروں کا مقصد یہ ہوتا ہے عظمائے امت، علمائے اعلام، رجالِ دین و دنیا کے تذکروں کو زندہ اور ان کے ناموں کو باقی رکھا جائے۔ اس میں تاریخی اور اجتماعی فوائد بھی ہیں اور اخلاقی درسیات بھی۔ اس سے ماضی کی زندگی کا اندازہ بھی ہوتا ہے اور مستقبل کے لئے عبرت و نصیحت، تجربات و مشاہدات کا ذخیرہ بھی جمع ہو جاتا ہے۔ قوم اپنے روشن مستقبل کے لئے تیار بھی ہو جاتی ہے اور اس کے سامنے ایک دستورِ زندگی بھی آجاتا ہے

روز و شب کی نورانیت اور قداست، عظمت و کرامت، سعادت و نحوست کا تعلق بھی انھیں حوادث سے ہوتا ہے جو ان دنوں میں واقع ہوتے ہیں اور اس اعتبار سے تاریخ میں عاشور سے زیادہ اہم و اعظم، اجل و اکرم دن نہیں پیدا ہوا۔ وہ دن جس میں

حسین مظلوم نے وہ عظیم اقدام کیا جس نے پورے عالم اسلام کے غیرت داروں کو سر بلند کر دیا۔ وہ دن جس نے مدرسۂ توحید و بندگی کے دروس کو عملی بنا دیا۔ وہ دن جس نے ظلم کے سامنے سر نہ جھکانے اور قربانی دینے کا اعلیٰ ترین نمونہ پیش کر دیا۔ وہ جس نے انسانی راہوں سے فساد و تباہی کی رکاوٹوں کو ہٹا دینے کا سلیقہ سکھا دیا۔ وہ دن جس نے رذائل اور پستیوں سے دور رہنے کا طریقہ بتا دیا۔ وہ دن جو ظالموں کی شان و شوکت کو پامال کرنے کی اصل بن گیا۔ وہ دن کہ جس نے شرک و نفاق کے پرچم کو سرنگوں کرنے کی بنیاد قائم کر دی۔ وہ دن جس نے جور و ظلم کو پامال کر کے انسانیت کو خواہشات کی اسیری سے چھڑا لیا۔ کلمۂ توحید، کلمۂ حق و صداقت، کلمۂ حیات و انسانیت کو بلند کر کے کلمۂ الٰہیہ کو صدق عدالت کے ساتھ تمام کر دیا کہ اب اس میں کسی تبدیلی کی گنجائش نہیں رہ گئی ہے۔

تاریخ میں صبحِ قیامت تک زندہ و پائندہ رہنے کا حقدار وہ دن ہے جو رسولِ اعظمؐ کے پارۂ جگر، نورِ نظر، قرۃ العین، قطعۃ اللحم والدم حسینؑ ابن فاطمہؑ کا دن ہے جو یوم اللہ الاکبر بھی ہے اور یوم الرسول الاعظمؐ بھی، یومِ ذبحِ عظیم بھی ہے اور یومِ فدیۂ کریم بھی۔ اسی لئے مقتلِ خوارزمی ۱۶۳۱ کی اس روایت کو قبول کئے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ امام حسینؑ کی ولادت کو پورے ایک سال کا زمانہ گذرا تو رسولؐ اللہ کے پاس بارہ مَلک اس عالم میں آئے کہ ان کے چہرے سرخ، پر و بال پریشان اور رسولِ اکرمؐ کو یہ خبر دیتے ہوئے کہ عنقریب آپ کے فرزند حسینؑ پر وہی مصیبت نازل ہونے والی ہے جو قابیل کی طرف سے ہابیل پر نازل ہوئی تھی، حسینؑ کو ہابیل کا اجر ملے گا اور قاتل پر قابیل جیسا بارِ عذاب ہوگا۔ اس کے بعد ملائکہ کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا ہے اور آسمان پر کوئی فرشتہ نہیں بچا جس نے حضرت کو حسینؑ کے قتل اور ان کے اجر و ثواب کی خبر نہ دی ہو۔ ملائکہ نے تربتِ حسینؑ بھی آپ کے سامنے پیش کی اور آپ برابر یہی کہتے رہے "خدایا! جو حسینؑ کو چھوڑ دے تو اسے چھوڑ دے، جو اسے قتل کرے تو اسے قتل کر دے اور اس کی مراد پوری نہ کرنا"۔

اور جب امام حسینؑ کی ولادت کو دو سال پورے ہوئے تو حضرت ایک سفر میں تھے۔ اتفاقاً درمیانِ راہ کھڑے ہو گئے اور اِنَّا لِلّٰہِ ارشاد فرمایا۔ آنکھوں سے آنسو

جاری ہو گئے۔ پوچھا گیا یا رسولؐ اللہ یہ کیا ہے؟ فرمایا یہ جبرئیل مجھے خبر دے رہے ہیں کہ فرات کے کنارے ایک زمین ہے، جس کا نام کربلا ہے اور وہیں میرا فرزند حسینؑ شہید ہوگا۔ سوال کیا گیا کہ حسینؑ کا قاتل کون ہوگا؟ فرمایا کہ ایک شخص ہوگا جس کا نام یزید ہوگا ـــــ خدا اسے خیر و برکت نہ دے ـــــ گویا میں اس منظر کو دیکھ رہا ہوں جب حسینؑ کا مدفن کربلا میں ہوگا اور ان کا سر بطور ہدیہ یزید کے سامنے پیش ہوگا۔ خدا کی قسم جو میرے فرزند کے سر کو دیکھ کر خوش ہوگا، خدا اس کے قلب و زبان میں اتفاق نہ دے گا اور اس کی زندگی منافق کی زندگی ہوگی ـــــ اس کے بعد حضرت سفر سے رنجیدہ اور مغموم واپس ہوئے اور منبر پر تشریف لے جا کر خطبہ ارشاد فرمایا۔ حسنؑ و حسینؑ آپ کے سامنے تھے۔ خطبہ ختم کر کے آپؐ نے اپنا ہاتھ حسینؑ کے سر پر رکھا اور رُخ آسمان کی طرف کیا۔ عرض کی "خدایا! میں تیرا رسولؐ اور تیرا بندہ محمدؐ ہوں۔ یہ دونوں میری پاکیزہ عترت اور بہترین ذریت ہیں یہی میرے وارث و جانشین ہیں۔ خدایا جبرئیلؑ نے مجھے خبر دی ہے کہ یہ میرا حسینؑ بے یار و مددگار شہید ہوگا۔ خدایا اس کے لئے قتل کو بابرکت قرار دیدے۔ اسے سادات شہداء میں شمار کر لے تو ہر شئے پر قادر و مختار ہے ـــــ خدایا اس کے قاتل کو برکتوں سے محروم کر دے"۔

یہ سننا تھا کہ مسجد نالہ و شیون کی آوازوں سے گونج اٹھی ـــــ حضرت نے فرمایا کہ تم لوگ رو تو رہے ہو مگر میرے حسینؑ کی مدد نہیں کرتے۔ خدایا تو حسینؑ کا ولی و مددگار بن جا!"۔

اس کے بعد خوارزمی نے ابن عباس کی زبانی حضرتؐ کا ایک خطبہ آخری عمر کا نقل کیا ہے جس کے الفاظ تقریباً ایسے ہی ہیں۔ غالباً وہ خطبہ حجۃ الوداع سے واپسی کا ہے۔ اور عجب نہیں کہ مرسلِ اعظمؐ کا امہات المومنین کے گھروں میں صفِ ماتم بچھانا اور وقتاً فوقتاً مقتلِ حسینؑ کا ذکر کرنا انھیں سالانہ مناسبات کی بنا پر ہو ـــــ اور یہ ایک سنتِ جاریہ ہو جو ناقابلِ تبدیل و ترمیم ہو!

اُمّ المومنین حضرت اُمِّ سلمہ کے گھر صفِ عزا

حافظِ کبیر ابوالقاسم طبرانی نے معجم میں نقل کیا ہے کہ مجھ سے علی بن سعید رازی نے ـــــ ان سے اسماعیل بن ابراہیم بن المغیرہ المروزی نے ـــــ ان سے علی بن الحسین بن واقد نے۔ ان سے ان کے والد نے۔ ان سے ابو غالب نے اور انھوں نے ابوامامہ سے نقل کیا ہے کہ حضور اکرمؐ نے اپنی ازواج کو تاکید کی تھی کہ میرے فرزند حسینؑ کو رونے نہ دینا ـــــ ایک دن آپ اُمِّ سلمہ کے گھر میں تھے، اتفاق سے جبرئیلؑ نازل ہو گئے۔ آپ نے ام سلمہ سے فرمایا کہ دیکھو خبردار اب میرے پاس کوئی نہ آنے پائے ـــــ اتنے میں حسینؑ آ گئے۔ آپ نے حضرت کو دیکھ کر قریب جانے کی کوشش کی۔ ام سلمہ نے گودی میں اٹھا لیا اور لوریاں دینے لگیں۔ جب حسینؑ کی آوازِ گریہ بلند ہوئی تو ام سلمہ نے چھوڑ دیا۔ حسینؑ دوڑ کر حضرت کی گودی میں بیٹھ گئے۔ جبرئیلؑ نے کہا یا رسول اللہؐ! اس بچّہ کو آپ کی اُمّت شہید کر دے گی۔ حضرت نے فرمایا تو کیا اسے شہید کرنے والے مسلمان ہوں گے؟ ـــــ عرض کی، جی ہاں! ـ اس کے بعد جبرئیلؑ نے ایک مُشتِ خاک اُٹھا کر رسولؐ کو دی کہ یہ شہید حسینؑ کی خاک ہے۔ حضرتؐ وہاں سے حسینؑ کو لئے ہوئے اُٹھے۔ چہرے سے غم والم کے آثار نمودار۔ ام سلمہ سمجھیں کہ یہ شاید بچّے کے پاس چلے جانے کا غصّہ ہے۔ گھبرا کر کہنے لگیں یا نبیؐ اللہ! آپ نے فرمایا تھا کہ اس بچّے کو رونے نہ دینا۔ جب بچّہ زیادہ رونے لگا تو میں نے مجبوراً راستہ دے دیا۔ آپ نے کوئی جواب نہیں دیا اور اصحاب کے مجمع میں چلے آئے۔ فرمایا میری اُمّت میرے بچّے کو قتل کر دے گی اتفاق سے ابوبکر اور عمر بھی موجود تھے اور یہ دونوں بہت بیباک تھے۔ کہنے لگے وہ مومن ہو کر کیسے قتل کریں گے؟

آپ نے فرمایا میرا قول بالکل صحیح ہے اور یہ تربت حسینؑ ہے جو میرے ہاتھوں میں ہے۔

حافظ ہیثمی نے "المجمع" ۹/ ۱۸۹ میں اس روایت کو طبرانی سے نقل کیا ہے اور اس پر یہ تبصرہ کیا ہے کہ اس کے رجال موثق ہیں اگرچہ بعض میں تھوڑا ضعف پایا جاتا ہے۔ امینی (طاب ثراہ) ــــــ کسی ایک آدمی کا رواۃ کو ضعیف قرار دیدینا اور اس کی وجہ نہ بیان کرنا اس ضعف کو بھی ضعیف قرار دیدیتا ہے اور علماء کی نظر میں اس کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا ہے، پھر جب کہ انھیں مُوثق بھی کہہ چکا ہو۔ علاوہ اس کے اس قسم کے مسائل میں ایسے راویوں کی روایت سے استدلال بالاتفاق درست ہے ــــــ

ممکن ہے کہ ہیثمی کا اشارہ علی بن سعید الرازی المتوفی ۲۹۹ھ شیخ الحدیث المعروف بہ علّیان کی طرف ہو جو حافظ ہونے کے ساتھ کثیر الاسفار بھی تھے جن کے بارے میں ابن یونس کا کہنا ہے کہ بعض لوگوں کو ان کے اوپر اعتراض ہے لیکن وہ اجلّہ محدّثین میں سے تھے، بادشاہ کے ساتھ رہتے تھے اور بعض اوقات ولایت کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔

ابن حجر کا بیان ہے کہ ممکن ہے یہ اعتراض سلطنت میں دخل اندازی کی بنیاد پر ہو ــــــ حمزہ بن محمد کتانی کا کہنا ہے کہ عبدان بن احمد جوالیقی ان کا احترام کیا کرتے تھے۔ مسلمہ بن قاسم کا قول ہے کہ علّیان ثقہ عالم بالحدیث تھے۔ ان سے بہت سے لوگوں نے روایت کی ہے ــــــ ابو احمد ابن عدی کہتے ہیں کہ مجھ سے ہیثم دوری نے بیان کیا ہے کہ وہ متوکل کے غلام رجاء کے ساتھ حدیث سُنا کرتے تھے۔ وہ جس کو چاہتا تھا اپنے ساتھ آنے دیتا تھا اور جس کو چاہتا تھا روک دیتا تھا۔ میں نے احمد بن نصر سے یہ سنا ہے کہ ایک مرتبہ انھوں نے ان کے بارے میں ابو عبد اللہ ابن ابی خیثمہ سے سوال کیا تو انھوں نے کہا، افسوس میں اس وقت تک زندہ رہ گیا جب ایسے افراد کے بارے میں سوال کیا جائے۔ (لسان المیزان ۴ ص ۲۳۱) ــــــ اس کے علاوہ رجال اسناد میں کوئی ایسا نہیں ہے جس پر جرح کی گئی ہو۔ علی بن الحسین بن واقد المتوفی ۲۱۱ھ تو صحاح ستّہ میں سے چار صحاح کے راوی ہیں اور "الادب المفرد" میں خود بخاری کے راوی ہیں۔ مقدمہ میں مسلم نے ان سے روایت کی ہے ــــــ حسین بن واقد ابو عبد اللہ قاضی

متوفی ۱۵۹ھ۔ بخاری کے علاوہ تمام صحاح کے راوی ہیں اور خود بخاری نے بھی تاریخ میں ان کی روایت درج کی ہے اور بہت سے علماء نے توثیق کی ہے ـــــ ابو غالب البصری جن کا نام حزور تھا بہت سی صحیح کتابوں کے راوی تھے اور ان کی بہت سے علماء نے توثیق کی ہے اور ان کی حدیث کو صحیح کا درجہ دیا ہے۔

راویوں کے حالات کے مآخذ:

تاریخ البخاری الکبیر ا ق ۲/۳۸۶، ۳ ق ۲/۲۶۷۔ طبقات ابن سعد ۷ ق ۲/۴،۱۰۔ الجرح والتعدیل لابن ابی حاتم ا ق ۲/۶۶، ۳ ق ۱/۱۷۹۔ تذکرۃ الحفاظ ۲/۲۸۴۔ تہذیب التہذیب ۲/۲۷۳، ۷/۲۰۸، ۱۲/۱۹۷۔ تذہیب الخزرجی ۲/۷۲، ۱۳۱، ۳۹۳۔ شذرات الذہب ۲/۲۷، ۲۳۲۔ لسان المیزان ۴/۲۳۱۔

دوسری سند کے الفاظ:

حافظ ابن عساکر نے تاریخ الشام میں بیان کیا ہے کہ مجھے ابوبکر محمد عبدالباقی نے خبر دی ہے اور انھیں ابو محمد الحسن بن علی نے املا فرمایا ہے ـــ ح ـــ مجھے ابو نصر ابن رضوان۔ ابو غالب احمد بن الحسن، ابو محمد عبداللہ بن محمد نے خبر دی ہے کہ ان حضرات سے ابو محمد الحسن بن علی نے ـــ ان سے ابوبکر بن مالک نے ـــ ان سے ابراہیم بن عبداللہ نے۔ ان سے حجاج نے ـــ ان سے حماد نے ـــ انھوں نے ابان سے ـــ اور انھوں نے شہر بن حوشب سے اور انھوں نے جناب اُمّ سلمہ سے نقل کیا ہے کہ جبرئیلؑ رسولِ اکرمؐ کی خدمت میں حاضر تھے۔ حسینؑ میرے پاس تھے۔ حسینؑ نے رونا شروع کیا۔ میں نے چھوڑ دیا، وہ رسولِ خداؐ کے پاس پہنچ گئے۔ جبرئیلؑ نے کہا اے محمدؐ! کیا آپ انھیں دوست رکھتے ہیں؟ انھوں نے فرمایا، بے شک۔ جبرئیل نے کہا کہ آپ کی اُمّت انھیں شہید کر دے گی اور اگر کہیے تو آپ کو اس زمین کی مٹی بھی دکھلا دوں۔ اور یہ کہہ اس خاک کو دکھلایا اور عرض کی کہ اس زمین کو کربلا کہتے ہیں۔

جنابِ اُمِّ سلمہ کے گھر میں دوسری صفِ عزا

حافظ کبیر القاسم الطبرانی نے "المعجم الکبیر" میں امام حسینؑ کے حالات میں لکھا ہے کہ مجھ سے عبداللہ بن احمد بن حنبل نے ـــــ ان سے عباد بن زیاد الاسدی نے ـــــ ان سے عمرو بن ثابت نے ـــــ انھوں نے اعمش سے ـــــ انھوں نے ابووائل شقیق بن سلمہ سے اور انھوں نے جناب امّ سلمہ سے نقل کیا ہے کہ حسنؑ و حسینؑ رسول اکرمؐ کے سامنے کھیل رہے تھے کہ یکبارگی جبرئیلؑ نازل ہوگئے اور حسینؑ کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ آپؐ کی اُمّت آپؐ کے اس فرزند کو شہید کردے گی۔ یہ سن کر حضرت نے حسینؑ کو سینے سے لگالیا اور رونے لگے۔ جبرئیلؑ نے تھوڑی سی مٹی حضرت کو بطورِ امانت دی۔ آپ نے اسے سونگھ کر فرمایا کہ یہ تو کرب وبلا کی خوشبو ہے ـــــ اس کے بعد وہ خاک مجھے دے کر فرمایا کہ جب یہ خون ہوجائے تو سمجھنا کہ میرا حسینؑ قتل ہوگیا ہے۔ میں نے اسے شیشے میں رکھ لیا اور برابر دیکھتی رہی اور یہ کہتی رہی ـــــ اللہ وہ دن کتنا عظیم ہوگا جب یہ خاک خون میں تبدیل ہوجائے گی۔

حافظ ابوالقاسم ابن عساکر دمشقی نے تاریخ الشام میں تحریر کیا ہے کہ مجھ سے ابوعلی الحداد وغیرہ نے اجازۃً نقل کیا ہے کہ ان سے ابوبکر بن ریذہ ـــ ان سے سلیمان بن احمد طبرانی نے ـــــ ان سے عبداللہ بن احمد بن حنبل نے مذکورہ بالا سند والفاظ کے ساتھ روایت کی ہے ـــــ فرق صرف یہ ہے کہ اس روایت میں "ریح کرب وبلاء" (کرب وبلا کی خوشبو) تھا اور اس روایت میں "ویح کرب وبلاء" (ہائے کرب وبلا) ہے۔

حافظ گنجی نے کفایہ ص ۲۷۹ میں نقل کیا ہے کہ مجھ سے حافظ یوسف بن خلیل بن

عبداللہ دمشقی نے حلب میں ــــ ان سے ابو عبداللہ محمد بن ابی زید کرانی نے ــــ ان سے فاطمہ بنت عبداللہ ابن احمد جوزدانیہ نے ــــ ان سے ابوبکر محمد بن عبداللہ بن زیدہ (ریذہ) نے ــــ ان سے حافظ ابوالقاسم سلیمان بن احمد طبرانی نے ــــ ان سے عبداللہ بن احمد بن حنبل نے مذکورہ بالا روایت کو ابن عساکر کے اسناد والفاظ میں بیان کیا ہے۔

رجال سند طبرانی قابلِ اعتبار ہیں:

۱۔ عبداللہ بن الامام احمد بن حنبل الشیبانی ابو عبدالرحمٰن البغدادی المتوفی ۲۹۰ھ بقول خطیب ثقہ محتاط اور فہیم تھے۔ نسائی، دارقطنی، ابوحاتم وغیرہ نے بھی توثیق کی ہے۔

۲۔ عباد بن زیاد الاسدی الساجی، بقول ابی داؤد صدوق تھے۔

۳۔ عمرو بن ثابت البکری ابو محمد الکوفی المتوفی ۱۷۲ھ۔ ابوداود نے سنن اص ۲۶ پر لکھا ہے کہ یہ رافضی اور بڑے آدمی تھے لیکن حدیث میں بڑے سچے تھے ــــ دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ ان کی حدیثیں شیعوں جیسی نہیں ہیں ــــ ابن حجر کا بیان ہے کہ ان کی حدیثیں مستقیم اور درست ہیں ــــ دوسرے مقام پر فرماتے ہیں کہ ان کی حدیثوں میں کوئی منکر بات نہیں ہے ــــ بزاز کا خیال ہے کہ یہ مائل بہ تشیع تھے ــــ ساجی کا ارشاد ہے کہ یہ مذموم ہیں اس لئے کہ عثمان پر اعتراض کیا کرتے تھے اور علیؑ کو شیخین پر مقدم کیا کرتے تھے۔

اس قسم کے بہت سے اعتراضات ہیں جو ان کے مذہب کے بارے میں وارد کئے گئے ہیں، لیکن کھلی ہوئی بات ہے کہ کسی آدمی کو مستقیم الحدیث اور صدوق تسلیم کرنے کے بعد اس کے مذہب پر اعتراض اس کی روایت کو مجروح نہیں بنا سکتا ہے۔

۴۔ الاعمش سلیمان بن مہران کوفی اسدی المتوفی ۱۴۵ھ، صحاح ستہ کے رجال میں ہیں۔ ابن معین اور نسائی نے توثیق کی ہے ــــ خریبی کا کہنا ہے کہ جب سے ان کا

انتقال ہوا ہے ان سے زیادہ عابد نہیں پیدا ہوا ہے اور وہ صاحبِ سنّت بزرگ تھے۔

۵۔ شقیق بن سلمہ اسدی ابو وائل کوفی المتوفی ۸۲ھ صحاح ستہ کے رجال میں ہیں۔ ابن معین نے ان کی توثیق کی ہے اور کہا ہے کہ ایسے اشخاص کے بارے میں سوال اٹھانا ہی غلط ہے۔ وکیع اور ابن سعد نے بھی ثقہ قرار دیا ہے ـــــ ابن عبد البر کا کہنا ہے کہ ان کی وثاقت پر علماء کا اجماع ہے۔

ابن عساکر کے شیوخِ حدیث:

۱۔ ابو علی الحداد الحسن بن احمد اصفہانی المقرئ المتوفی ۵۱۵ھ ۹۶ برس کی عمر میں انتقال فرمایا۔ اپنے وقت میں سند تھے، عالی السند ہونے کے علاوہ کثیر الروایۃ بھی تھے۔ صاحبِ خیر، صالح اور معتمد تھے۔ جملہ علماء نے آپ کی توثیق کی ہے۔

۲۔ ابوبکر بن ریذہ محمد بن عبد اللہ بن احمد اصفہانی المتوفی ۴۴۰ھ بقول یحییٰ بن مندہ ثقہ امین تھے۔ سرآمدِ روزگار تھے۔ وافر العقل، کامل الفضل، اہل العلم میں لائقِ احترام تھے۔

گنجی کے شیوخِ حدیث:

۱۔ حافظ یوسف بن خلیل دمشقی المتوفی ۶۴۸ھ۔ ابو الفرج دمشقی نے طبقات الحنابلہ کے ذیل میں لکھا ہے کہ یہ امام حافظ ثقہ ثبت عالم واسع الروایۃ، جمیل السیرۃ، کثیر الاسفار تھے۔ ذہبی کا کہنا ہے کہ یہ شروطِ صحیح میں داخل ہیں۔

۲۔ ابو عبد اللہ محمد بن ابو زید کرانی اصفہانی متوفی ۵۹۷ھ۔ آپ کا انتقال سو برس کی عمر میں ہوا ہے۔

۳۔ فاطمہ جوزدانیہ ام ابراہیم بنت عبد اللہ بن احمد اصفہانی متوفاۃ ۵۲۴ھ۔ آپ کا انتقال ۹۹ برس کی عمر میں ہوا ہے۔ آپ محدثہ محتاط صاحبِ تقویٰ تھیں۔ حفاظ کی ایک جماعت نے آپ سے روایت کی ہے اور مشائخِ حدیث نے آپ کے سامنے حدیثیں

پڑھی ہیں۔

مقتل خوارزمی :

مقتل خوارزمی ص ۱۷۰ پر یہ روایت ان الفاظ میں درج ہوئی ہے کہ جب جبرئیلؑ آپ کے دونوں شہزادوں میں سے کسی کے مقتل کی خاک لے کر آپ کے پاس آتے تھے اور جگہ کا نام نہیں بتاتے تھے تو آپ خاک سونگھ کر بتا دیا کرتے تھے کہ یہ مقتلِ حسینؑ کی خاک ہے اور جبرئیلؑ اس کی تصدیق فرمایا کرتے تھے۔

رجال حدیث کے حالات کے مآخذ :

تاریخ البخاری ۲ ق ۲ ص ۳۸۔ الجرح والتعدیل ۲ ق ۱ ص ۱۴۶، ۱۷۱، ۲ ق ۲/ ۷۔ تاریخ بغداد ۹ ص ۳-۱۳، ۲۹۸-۱۷۱-۲۷۵۔ المنتظم ۹ ص ۲۲۸۔ ذیل طبقات الحنابلہ لابی الفرج الدمشقی ۲ ص ۲۴۴-۲۴۵۔ تذکرۃ الحفاظ ذہبی ۴ ص ۱۹۵۔ دول الاسلام ذہبی ۲ ص ۳۰۔ النجوم الزاہرہ ۵ ص ۲۴۶-۶ ص ۱۸۰-۷ ص ۳۲۔ مرأۃ الجنان ۳ ص ۲۱۱، ۲۳۲۔ تہذیب التہذیب ۴ ص ۳۶۱-۳۶۲، ۴ ص ۲۲۲-۲۲۶، ۵ ص ۹۴-۱۴۱-۱۴۳، ۸ ص ۹۔ شذرات الذہب ۳ ص ۲۶۵، ۴ ص ۴۷-۶۹-۲۳۲، ۵ ص ۲۴۳۔ اعلام النساء ۳ ص ۱۱۶۶۔ تکملہ ابن الصابونی حاشیہ ص ۱۰۹۔

دیگر مصادر حدیث :

ذخائر العقبیٰ ص ۱۴۷۔ طرح التریث حافظ عراقی ۱/ ۴۲۔ مجمع الزوائد ۹/ ۱۸۹۔ للمواہب اللدنیہ ۲/ ۱۹۵۔ الخصائص الکبریٰ سیوطی ۲/ ۱۲۵۔ الصراط السوی للشیخانی المدنی ص ۹۳۔ جوہرۃ الکلام ص ۱۲۰۔

ایک نظر :

حافظ جمال الدین زرندی نے نظم الدرر ص ۲۱۵ پر ہلال بن خباب سے ایک

روایت درج کی ہے جس کے بارے میں میرا خیال ہے کہ وہ بھی اسی روایت کی ایک شکل ہے۔ الفاظ یہ ہیں۔ جبرئیلؑ پیغمبرؐ اسلام کی خدمت میں حاضر تھے کہ حسنؑ و حسینؑ آگئے اور نبیؐ کی پشت پر بیٹھ گئے۔ آپ نے جناب فاطمہؑ سے کہا کہ انھیں ہٹاتی نہیں ہو؟۔ انھوں نے ہٹالیا۔ تھوڑی دیر کے بعد دونوں چھڑا کر پھر پشت پر بیٹھ گئے۔ حضرت نے دونوں کو اٹھا کر گودی میں بٹھالیا۔ جبرئیلؑ نے کہا غالباً آپ دونوں سے محبّت فرماتے ہیں؟۔ آپ نے فرمایا کیوں کر محبّت نہ کروں، یہ دونوں میرے دو پھول ہیں! ۔ جبرئیلؑ نے کہا، اچھا تو سنئے آپ کی اُمّت آپ کے حسینؑ کو قتل کر دے گی اور اُس سرزمین کی یہ خاک ہوگی۔ آپ نے فرمایا کہ اس خاک کا کیا نام ہے؟ جبرئیلؑ نے عرض کی۔ کربلا۔

ہلال بن خباب کہتے ہیں کہ جب امام حسینؑ اس سرزمین پر پہنچے جہاں آپ کی شہادت ہوئی تو ایک نبطی شخص کو آپ کے پاس لایا گیا۔ آپ نے اس سے پوچھا کہ اُس سرزمین کا کیا نام ہے؟ اُس نے کہا کربلا! آپ نے فرمایا رسولؐ اللہ نے سچ فرمایا تھا یہ زمینِ کرب و بلا ہے۔ اچھا اب سامان اتار لو، یہیں ہمارا قیام ہوگا اور یہیں ہمارے خون بہیں گے۔

(ہلال خود انتہائی موثق آدمی ہیں۔ ان کی مرسل روایت حسن بن محمد حنفیہ، محمد حنفیہ ام سلمہ سے ہوتی ہے جو سب معتبر ہیں۔)

فرشتۂ باران کی آمد پر بیتِ اُمِّ سلمہ میں ماتم

امام احمد نے مسند ۲۴۲/۳ میں تحریر فرمایا ہے کہ مجھ سے موئل نے، ان سے عمارہ بن زاذان نے، ان سے ثابت نے اور ان سے انس بن مالک نے بیان کیا ہے کہ فرشتۂ باران نے پروردگار سے رسولِ اکرمؐ کے پاس حاضری دینے کی اجازت طلب کی اور قدرت نے اجازت دے دی ـــــ حاضرِ خدمت ہوا۔ حضرتؐ نے امِّ سلمہ سے کہا کہ اب میرے پاس کوئی شخص آنے نہ پائے۔ اتفاق سے حسینؑ آ گئے۔ امِّ سلمہ نے روک دیا۔ وہ اصرار کر کے داخل ہو گئے اور حضورؐ کی پشتِ اقدس، دوشِ مبارک وغیرہ پر بیٹھنے لگے۔ مَلَک نے پیغمبرؐ سے عرض کی کہ کیا آپ اس بچّے کو دوست رکھتے ہیں؟ آپ نے فرمایا۔ بے شک! ۔ اس نے کہا، لیکن آپ کی اُمّت تو اسے قتل کر دے گی، اور اگر آپ چاہیں تو میں وہ جگہ بھی دکھلا دوں جہاں اسے شہید ہونا ہے۔ یہ کہہ کر ہاتھ مارا اور ایک سرخ مٹّی اُٹھا کر دے دی ـــــ جنابِ امِّ سلمہ نے اسے لے کر چادر میں باندھ لیا ـــــ ثابت کا بیان ہے کہ ہماری اطلاع کی بنا پر وہ خاکِ کربلا تھی۔

مسند ۲۶۵/۳ پر عبد الصمد بن حسان۔ عمارہ کے اسناد سے ـــــ اور مسند ابو یعلیٰ میں شیبان۔ عمارہ بن زاذان کے اسناد سے ان الفاظ میں روایت نقل ہوئی ہے کہ فرشتۂ باران نے اپنے رب سے زیارتِ پیغمبرؐ کی اجازت مانگی اور جب اجازت مل گئی تو حاضرِ خدمت ہوا۔ حضرتؐ اس وقت جنابِ امِّ سلمہ کے گھر میں تھے۔ آپ نے فرمایا اے امِّ سلمہ دروازہ کو دیکھتی رہو اور کسی کو آنے نہ دینا۔ اتنے میں حسینؑ بن علیؑ آ گئے۔ انھوں نے دروازہ کو زور دے کر کھول لیا۔ حضرتؐ نے انھیں سینے سے لگا لیا اور بوسے دینے لگے۔ مَلَک نے کہا کہ آپ انھیں دوست رکھتے ہیں؟ آپ

فرمایا، بے شک! ۔ مَلک نے ایک مشت سرخ مٹی اٹھا کر آپ کو دی اور کہا کہ یہ آپ کے فرزند کے مقتل کی خاک ہے۔ اسے آپ کی اُمت شہید کر دے گی۔ ام سلمہ نے اس خاک کو اپنے کپڑے میں محفوظ کر لیا اور بقول ثابت وہ خاک کربلا کی ہے۔

حافظ ابو نعیم نے دلائل ۲۰۲/۳ میں محمد بن الحسن بن کوثر سے، انھوں نے بشر بن موسیٰ سے، انھوں نے عبد الصمد بن حسان سے، انھوں نے عمارہ سے انھیں اسناد اور لفظ کے ساتھ روایت درج کی ہے۔ اس کے بعد لکھا ہے سلیمان بن احمد کی روایت کی بنا پر حضرت نے اس خاک کو سونگھ کر فرمایا کہ اس سے کرب و بلا کی بو آتی ہے۔

ان تمام روایات کے اسانید صحیح اور ان کے رواۃ مُوثق ہیں جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

رواۃ حدیث:

۱۔ مومل بن اسماعیل عدوی ابو عبدالرحمٰن البصری نزیل مکہ متوفی ۲۰۵ھ اکثر صحاح کے راوی ہیں۔ ابن معین، دارقطنی، ابن سعد، ابن راہویہ وغیرہ نے آپ کی توثیق کی ہے۔

۲۔ عمارۃ بن زاذان صیدلانی ابو سلمہ البصری۔ ابو داؤد، ترمذی، ابن ماجہ اور الادب المفرد میں بخاری کے راوی ہیں۔ امام احمد یعقوب بن سفیان اور عجلی وغیرہ نے آپ کی توثیق کی ہے۔

۳۔ ثابت بن اسلم البنانی ابو محمد البصری متوفی ۱۲۷ھ صحاح ستہ کے راوی ہیں اور تمام علماء نے ان کی توثیق کی ہے۔

۴۔ عبد الصمد بن حسان صالح الحدیث، صدوق ثقہ تھے۔ بخاری نے تاریخ میں، ابن ابی حاتم نے الجرح والتعدیل ۵۱/۳ میں اور ابن حبان نے آپ کا ذکر ثقات میں کیا ہے۔

۵۔شیبان بن فروخ ابن ابی شیبہ ابو محمد الابلی المتوفی ۲۳۵ھ۔ مسلم، ابو داؤد نسائی کے رجال میں ہیں۔ احمد بن حنبل، مسلمہ وغیرہ نے آپ کی توثیق کرتے ہوئے آپ کے صدق وصلاح کی تعریف کی ہے۔

یہ رواۃ وہ تھے جو تمام اسناد میں مشترک تھے۔ جن کی وثاقت ظاہر ہو چکی ہے۔ صرف ابو نعیم کے رجال میں سے بشر باقی رہ گئے، جن کا تذکرہ بعد میں ہوگا۔

★ حافظ طبرانی نے معجم کبیر کے جزء اوّل میں امام حسینؑ کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مجھ سے بشر بن موسیٰ اور ان سے عبد الصمد بن حسان مروزی نے بیان کیا ہے۔

ح: مجھ سے محمد بن عبد اللہ حضرمی۔ محمد بن محمد التمار البصری اور عبدان بن احمد نے بیان کیا ہے کہ ان سے شیبان بن فروخ نے باسناد مذکور روایت کی ہے کہ فرشتۂ بارش نے اپنے رب سے اجازت طلب کی کہ نبی اکرمؐ کی زیارت کرے۔ قدرت نے اجازت دے دی۔ وہ اس وقت حاضر ہوا جب حضرتؐ ام سلمہ کے گھر میں تھے۔ آپؐ نے ام سلمہ سے فرمایا کہ دروازہ بند رکھو کوئی آنے نہ پائے۔ اتنے میں حسینؑ آ گئے اور انھوں نے دروازہ کھول لیا اور پشتِ رسول پر کھیلنے لگے۔ حضرت نے ان کے بوسے لینے شروع کر دیئے۔ ملک نے عرض کی۔ کیا آپ اس بچّے سے محبّت فرماتے ہیں؟ آپ نے فرمایا یقیناً! ــــ ملک نے عرض کی، لیکن آپ کی اُمّت اسے قتل کر دے گی اور اگر آپ چاہیں تو میں اس جگہ کی خاک بھی دکھلا دوں جہاں یہ قتل واقع ہوگا ــــ اس کے بعد ایک مشت خاکِ سُرخ اٹھا کر حضرت کو دی۔ جنابِ امّ سلمہ نے اسے لے لیا اور اپنے کپڑے میں محفوظ کر لیا۔ بقول ثابت وہ خاکِ کربلا تھی۔

اس روایت کے اسناد بھی صحیح اور رجال ثقات ہیں۔ تفصیل حسب ذیل ہیں:

۱۔ بشر بن موسیٰ بن صالح الاسدی البغدادی المتوفی ۲۸۸ھ۔ ۹۸ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ ثقہ، امین وعاقل تھے۔ تمام علماء نے توثیق کی ہے۔

۲۔ محمد بن عبد اللہ الحضرمی ابو جعفر الکوفی الشہیر بمطین المتوفی ۲۹۷ھ حافظ ثقہ شہیر تھے۔

۳۔ محمد بن محمد ابو جعفر التمار البصری المتوفی ۲۸۹ھ ابن حبان نے آپ کا ذکر ثقات میں کیا ہے۔

۴۔ ابو محمد عبدان بن احمد بن موسیٰ الجوالیقی المتوفی ۳۰۶ھ۔ امام حافظ ثقہ تھے۔ انھیں ایک لاکھ حدیثیں حفظ تھیں۔

★ حافظ بیہقی نے دلائل النبوۃ کے باب اخبار النبی بقتل الحسین میں اس روایت کو اس طرق سے نقل کیا ہے کہ مجھے علی بن احمد بن عبدان نے اور انھیں احمد بن عبید الصفار نے خبر دی ہے کہ ان سے بشر بن موسیٰ نے اور ان سے عبد الصمد بن حسان نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے کہ "فرشتۂ باران" نے جناب احدیت سے حضور پیغمبرؐ میں آنے کی اجازت مانگی اور جب اجازت مل گئی تو حاضرِ خدمت ہوا حضرتؐ نے امّ سلمہ سے فرمایا کہ دروازے پر نظر رکھو اور کسی کو داخل نہ ہونے دینا۔ اتفاق سے حسینؑ آ گئے اور وہ حضرتؐ کے پاس چلے گئے اور آپؐ کے دوش پر کھیلنے لگے۔ ملک نے عرض کی کہ آپ اس فرزند کو دوست رکھتے ہیں؟ آپ نے فرمایا بے شک! ملک نے کہا کہ اسے آپ کی اُمّت قتل کر دے گی اور اگر چاہیں تو میں آپ کو وہ جگہ بھی دکھلا دوں جہاں اس کی شہادت ہوگی۔ یہ کہہ کر ایک ہاتھ مارا اور ایک مٹھی خاکِ سُرخ لا کر پیش کر دی۔ امّ سلمہ نے اس خاک کو اپنے کپڑے کے ایک گوشے میں باندھ لیا۔ یہ خاکِ کربلا تھی۔ (بیہقی کا کہنا ہے کہ اسی طرح شیبان بن فروخ نے عمارہ بن زاذان کے واسطے سے نقل کیا ہے۔)

★ فقیہ ابن المغازلی الواسطی نے کتاب المناقب میں محمد بن محمد بن سلیمان باغندی سے، انھوں نے شیبان بن فروخ سے اور انھوں نے عمارہ سے مذکورہ سند سے روایت کی ہے نقل کیا ہے۔

★ حافظ ابن عساکر نے تاریخ الشام میں بیان کیا ہے کہ مجھے ابو بکر محمد بن عبد الباقی نے، انھیں حسین بن علی نے، انھیں ابو الحسین ابن المظفر نے، انھیں محمد بن محمد بن سلیمان نے، انھیں شیبان نے یہی روایت سنائی ہے۔ فرق یہ ہے ابو یعلیٰ کے الفاظ میں کہ حسینؑ

پشت پیغمبرؐ پر کھیلنے لگے۔ پیغمبرؐ نے انھیں بوسے دینا شروع کر دیئے۔

* ابن عساکر ہی کا بیان ہے کہ مجھے ابو یعقوب یوسف بن ایوب نے، انھیں ابوالحسین محمد بن علی المہتدی باللہ نے خبر دی ہے۔

ح ــــ مجھے ابو غالب ابن البناء نے۔ انھیں ابوالغنائم عبدالصمد بن علی نے خبر دی ہے کہ ہم سے عبیداللہ بن محمد بن اسحاق نے، ان سے عبداللہ بن محمد نے، ان سے ابو محمد شیبان ابن ابی شیبہ نے اپنے اسناد سے طبرانی کے الفاظ میں روایت کی ہے۔

* حافظ محب الدین طبری نے ذخائر العقبیٰ ص ۱۴۶ و ص ۱۴۷ میں معجم بغوی سے اور صحیح ابن حاتم سے اور مسند احمد سے نقل کیا ہے ــــ پھر ابن عساکر نے تاریخ شام ۴/۳۲۵ سے ان کی روایت نقل کی ہے اور آخر میں تحریر کیا ہے کہ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ وہ خاک حضرتؐ نے امّ سلمہ کو بطور امانت دی تھی کہ جب یہ خاک خون ہو جائے تو سمجھو کہ میرا فرزند شہید ہو گیا ہے۔ جناب امّ سلمہ نے اسے ایک شیشے میں رکھ لیا اور برابر اسے دیکھتی رہیں اور یہ کہتی رہیں کہ جس دن تو خون ہو جائے گی وہ دن انتہائی عظیم ہوگا۔

* حافظ عراقی نے طرح التثریب ۱/۴۱ پر اس روایت کو احمد سے نقل کیا ہے۔

* حافظ ہیثمی نے مجمع ۹/۱۸۷، ۱۹۰ پر اس روایت کو احمد، ابو یعلیٰ، البزاز اور طبرانی سے نقل کرنے کے بعد یہ تبصرہ کیا ہے کہ اسناد ابو یعلیٰ کے رجال صحیح ہیں صرف عمارہ بن زاذان کی ذات اختلافی ہے۔ ایک جماعت نے ان کی توثیق کی ہے لیکن اس میں قدرے ضعف ہے۔

* قرطبی نے "مختصر التذکرہ" ص ۱۱۹ پر اس روایت کو احمد کے حوالے سے نقل کیا ہے۔

* حافظ ابن حجر نے صواعق ص ۱۱۵ پر معجم بغوی کے حوالے سے نقل کر کے لکھا ہے کہ ابو حاتم نے اپنی صحیح اور احمد نے مسند میں درج کیا ہے۔ عبد بن حمید اور ابن احمد وغیرہ نے بھی اسی طرح درج کیا ہے لیکن اس میں یہ اضافہ ہے کہ وہ فرشتہ جبرئیل تھا۔

تو اگر یہ بات صحیح ہے تو واقعہ دو مرتبہ کا ہے ـــــ ابن احمد نے خاک کو سونگھ کر "بوئے کرب و بلا" کہنے کا بھی ذکر کیا ہے۔

ابن احمد نے زیادۃ المسند میں تحریر کیا ہے کہ حضورؐ نے مجھے وہ سُرخ خاک عطا فرمائی اور کہا کہ یہ خاکِ مقتلِ حسینؑ ہے، جب یہ خون ہو جائے تو سمجھنا کہ میرا حسین مارا گیا۔ اُمِّ سلمہ کہتی ہیں کہ میں نے اسے ایک شیشہ میں رکھ لیا اور یہ کہتی رہی کہ جس دن یہ خاک خون ہو جائے گی وہ بڑا عظیم دن ہوگا ـــــ ایک روایت میں ہے کہ میں نے روزِ عاشورہ اس پر نظر ڈالی تو وہ خون ہو چکی تھی ـــــ ایک روایت میں ہے کہ جبرئیلؑ نے کہا، کیا میں آپ کو خاکِ مقتل دکھا دوں؟ اور اس کے بعد چند سنگ ریزے اٹھا کر دیئے۔ حضرت نے ایک شیشے میں رکھ دیئے۔ جناب امِّ سلمہ کا بیان ہے کہ شبِ شہادتِ حسینؑ میں نے ہاتفِ غیبی کی آواز سُنی :

"اے حسینؑ کو قتل کرنے والو! عذاب اور ذلّت کے لئے تیار ہو جاؤ۔"

"تم سلیمان بن داؤد، موسیٰ اور عیسیٰ کی زبان پر بھی ملعون رہ چکے ہو۔"

اب جو میں نے شیشہ کو کھولا تو دیکھا کہ سنگ ریزوں سے خون اُبل رہا ہے ـــ!

(آخری حصّہ جمال الدین زرندی کی نظم الدرر کے ص ۲۱۷ پر حرف بحرف موجود ہے۔)

✱ حافظ ابن حجر ہی نے اپنی کتاب "اشرف الوسائل" شرح شمائل ترمذی میں بغوی کے حوالے سے انس سے روایت کی ہے کہ ایک مَلک نے پروردگار سے زیارتِ پیغمبرؐ کی اجازت چاہی، اور جب اجازت لے کر حاضرِ خدمت ہوا تو آپ جناب امِّ سلمہ کے گھر میں تھے۔ آپ نے فرمایا، اُمِّ سلمہ دروازے پر نظر رکھنا کوئی داخل نہ ہونے پائے۔ اتفاق سے حسینؑ داخل ہو گئے اور سیدھے پیغمبرؐ کے پاس پہنچ گئے۔ آپ نے انھیں گلے سے لگا لیا اور بوسے دینا شروع کر دیئے۔ مَلک نے پوچھا کہ حضورؐ آپ ان سے محبت فرماتے ہیں؟ ـــــ فرمایا یقیناً! ـــــ عرض کی آپ کی اُمّت اسے قتل کر دے گی، اور اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو وہ مقتل بھی دکھلا دوں ـــــ؟ یہ کہہ کر وہ جگہ دکھلائی اور تھوڑی سی سُرخ مٹی اُٹھا کر دی۔ اُمِّ سلمہ نے اس مٹی کو لے کر کپڑے

میں باندھ لیا ـــــ ثابت کا بیان ہے کہ ہم لوگ اسے خاکِ کربلا کہتے تھے۔

ابو حاتم نے اسے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے اور احمد نے بھی اسی طرح روایت کی ہے لیکن ملّا نے اتنا اضافہ کیا ہے کہ جناب امّ سلمہ نے فرمایا کہ حضرت نے وہ خاک مجھے دے کر کہا کہ جب یہ خون ہو جائے تو سمجھنا کہ میرا حسین شہید ہو گیا ہے۔ میں نے اسے ایک شیشے میں محفوظ کر لیا اور یہ کہنا شروع کیا کہ جس دن یہ خاک خون ہو جائے گی وہ بڑا عظیم دن ہو گا ـــــ چنانچہ امام حسینؑ فرات کے کنارے کوفہ کے قریب کربلا میں شہید ہوئے۔ سنان بن انس نے آپ کو شہید کیا یا کسی دوسرے شخص نے۔ اور جب آپ کے سر کو یزید کی طرف روانہ کیا گیا تو ایک مقام پر قافلہ ٹھہرا۔ اچانک کیا دیکھا کہ ایک غیبی ہاتھ برآمد ہوا جس میں لوہے کا قلم تھا اور اس نے ایک دیوار پر یہ خونی تحریر لکھ دی: "کیا وہ امّت بھی روزِ قیامت حسینؑ کے جد کی شفاعت کی امیدوار ہے جس نے حسینؑ کو قتل کیا ہے"۔ چنانچہ یہ دیکھ کر لوگ سر کو چھوڑ کر بھاگ گئے ـــــ یہ روایت منصور بن عمار کی ہے۔ اس کے علاوہ حسب ذیل رواۃ و محدثین اور ہیں:

* ابو الہدیٰ ضوء الشمس ۱/۹۷، ۹۸
* حافظ قسطلانی مواہب اللدنیہ ۲/۱۹۵ بروایت بغوی و ابی حاتم و احمد۔
* حافظ سیوطی خصائص کبریٰ ۲/۱۲۵ بحوالہ بیہقی و ابو نعیم و کنز العمال ۶/۲۲۳
* السید محمود الشیخانی "الصراط السوی" بحوالہ احمد۔
* القراغولی۔ "جوہرۃ الکلام" ص ۱۱۷ بحوالہ ابن حجر، اخراج ابی حاتم، روایت احمد۔
* عماد الدین العامری "شرح بہجۃ المحافل" ۲/۲۳۶
* حافظ خوارزمی مقتل الحسینؑ ۱/۱۶۲ میں شرجیل بن ابی عون کے حوالے سے ناقل ہیں کہ وہ فرشتہ بحار تھا اور اس کا قصہ یہ ہے کہ جنّت کے ملائکہ میں سے ایک ملک سمندر میں نازل ہوا اور اپنے پروں کو پھیلا کر شور کیا، اہلِ بحار! سیاہ کپڑے پہن لو۔ نبیؐ کا فرزند شہید ہونے والا ہے۔ اس کے بعد نبیؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی، اے حبیب خدا، اس سرزمین پر آپ کی امّت کے دو فرقوں میں جنگ ہو گی۔ ایک

ظالم، جابر اور فاسق ہوگا جو آپ کے فرزند ابنِ زہرؑا کو کربلا میں شہید کردے گا اور یہ اس کی خاکِ تربت ہے ——— یہ کہہ کر ایک مشت خاکِ کربلا نبیؐ کو دی اور کہا کہ اسے بطورِ علامت محفوظ رکھیئے۔ اس کے بعد اپنے پروں پر تھوڑی سی خاک لے کر اُڑ گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آسمان پر کوئی فرشتہ ایسا نہیں رہا جس نے وہ خاک نہ سونگھی ہو، اور اسے اس واقعہ کی اطلاع نہ ملی ہو ——— اس کے بعد خود حضرتؐ نے اس خاک کو سونگھا اور رو رو کر کہنا شروع کیا۔ خداوندا، میرے فرزند کے قاتل کو برکت نہ دینا، اسے جہنم واصل کردینا پھر وہ خاک جنابِ امِ سلمہ کو دی اور انھیں شطِ فرات پر شہادتِ حسینؑ کی خبر سنائی۔ فرمایا، اے امِ سلمہ! اس خاک کو محفوظ رکھو، جب یہ منتشر ہوکر خون ہوجائے تو سمجھنا میرا فرزند حسینؑ شہید ہوگیا ہے۔"

اُمّ المومنین عائشہ کے گھر صفِ ماتم

حافظ محمد بن عبداللہ بن البرقی کہتے ہیں کہ مجھ سے سعید بن ابی مریم نے، ان سے یحییٰ بن ایوب نے، ان سے ابن غزیہ نے، ان سے محمد بن ابراہیم نے ان سے ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن نے بیان کیا ہے کہ حضرت عائشہ کے گھر میں ایک مشربہ (آبدارخانہ) تھا۔ جب حضرتؐ پر وحی کا نزول ہوتا تھا تو آپ وہیں تشریف لے جایا کرتے تھے۔ ایک دن آپ مشربہ پر گئے اور عائشہ کو منع فرما گئے کہ کوئی دوسرا نہ آنے پائے۔ اتفاق سے حسینؑ بن علیؑ داخل ہو گئے اور سیدھے پیغمبرؐ کے پاس چلے گئے، عائشہ کو خبر بھی نہ ہوئی۔ جبرئیلؑ نے حسینؑ کو دیکھ کر پوچھا —— یہ کون ہے؟ حضرتؐ نے فرمایا، یہ میرا فرزند ہے! اور یہ کہہ کر حسینؑ کو گودی میں بٹھالیا۔ جبرئیلؑ نے کہا کہ اسے تو آپؐ کی اُمّت شہید کر دے گی حضرتؐ نے فرمایا "میری اُمّت؟"۔ عرض کی "جی ہاں! اور اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو وہ سرزمین بھی دکھلا دوں"۔ یہ کہہ کر جبرئیلؑ نے اشارہ کیا اور طفِ عراق سے ایک سُرخ مٹی اٹھا کر حضرتؐ کو دکھلادی۔

* السید محمود مدنی نے "الصراط السوی" میں اس روایت کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ ابن سعد نے بھی اس روایت کا اخراج کیا ہے لیکن اتنا اضافہ کیا ہے کہ جبرئیلؑ نے کہا کہ یہ خاکِ مقتلِ حسینؑ ہے۔

اس روایت کے رجال، صحاح ستہ کے رجال اور موثق و معتبر افراد ہیں جیسا کہ آئندہ بیان ہوگا۔ خود ابن البرقی بھی ابوداؤد اور نسائی کے رواۃ میں ہیں اور موثق بھی ہیں۔ (تذکرۃ الحفاظ)

دیگر اسناد:

حافظ ابو قاسم الطبرانی نے معجم کبیر میں امام حسینؑ کے حالات میں درج کیا ہے کہ مجھ سے احمد بن رشدین مصری نے ـــــ ان سے عمرو بن خالد حرانی نے، ان سے ابن لہیعہ نے، ان سے ابوالاسود نے، ان سے عروہ بن الزبیر نے، ان سے حضرت عائشہ نے بیان کیا ہے کہ ایک دن حسینؑ بن علیؑ رسولِ اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرتؐ پر وحی نازل ہو رہی تھی اور آپ سر جھکائے ہوئے تھے۔ حسینؑ آپؐ کی پشت پر بیٹھ گئے ـــــ جبرئیلؑ نے کہا اے محمدؐ! کیا آپ انھیں دوست رکھتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا کیوں نہیں۔ یہ میرا فرزند ہے! عرض کی کہ اسے تو عنقریب آپ کی اُمت شہید کر دے گی اور یہ کہہ کر ہاتھ بڑھایا اور ایک سفید مٹی آپ کو دے دی اور کہا کہ آپ کا فرزند اسی زمین پر قتل ہوگا اس کا نام طف ہے ـــــ پھر جب جبرئیلؑ چلے گئے تو میں نے دیکھا کہ حضرت اس خاک کو لئے ہوئے گریہ فرما رہے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا، اے عائشہ! جبرئیلؑ نے مجھے یہ خبر دی ہے کہ میرا فرزند سرزمینِ طف پر شہید ہوگا۔ میرے بعد میری اُمت فتنہ میں پڑ جائے گی۔ اس کے بعد آپ حلقۂ اصحاب میں آئے جہاں علیؑ و ابوبکر و عمر و حذیفہ و عمار و ابوذر وغیرہ جمع تھے۔ آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ لوگوں نے پوچھا یا حضرتؐ یہ رونے کا کیا سبب ہے؟۔ آپؐ نے فرمایا کہ مجھے جبرئیل نے خبر دی ہے کہ میرے بعد میرا فرزند زمینِ طف پر شہید ہوگا۔ جبرئیلؑ نے مجھے یہ خاک بھی دی ہے اور کہا ہے کہ یہ اس کی خواب گاہ کی خاک ہے۔

* امام ابوالحسن الماوردی نے اعلام النبوۃ ص ۸۳ کے بارہویں باب میں اسی روایت کو انھیں اسناد و الفاظ کے ساتھ حرف بحرف نقل کیا ہے۔

اسنادِ دیگر:

ابن سعد صاحبِ طبقاتِ کبریٰ بیان کرتے ہیں کہ مجھے محمد بن عمر نے ـــــ انھیں

موسیٰ بن محمد نے، انھیں ان کے باپ ابراہیم نے، انھیں ابوسلمہ نے اور انھیں عائشہ نے خبر دی ہے کہ ان کے گھر میں ایک مشربہ تھا جہاں حضرت جبرئیلؑ سے ملاقات فرمایا کرتے تھے۔ ایک دن آپ جبرئیل سے مصروفِ گفتگو تھے اور مجھے یہ حکم دے دیا تھا کہ کوئی میرے پاس آنے نہ پائے۔ اتفاق سے حسینؑ بن علیؑ آ گئے اور بغیر میری اطلاع کے حضرتؐ کے پاس پہنچ گئے۔ آپ نے انھیں اٹھا کر گودی میں بٹھا لیا۔ جبرئیل نے کہا کہ یہ بچہ شہید ہو گا۔ حضرتؐ نے پوچھا کون شہید کرے گا؟ عرض کی آپ کی اُمت! فرمایا میری امت؟ عرض کی بیشک! اور اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو وہ زمین بھی دکھلا دوں۔ یہ کہہ کر اشارہ کیا اور طرف عراق سے ایک سُرخ مٹی اٹھا کر حضرتؐ کو دے دی اور کہا کہ یہ اس کے مقتل کی خاک ہے۔

★ حافظ ابن عساکر نے تاریخ الشام میں نقل کیا ہے کہ مجھے ابوبکر محمد بن عبدالباقی نے، انھیں حسن بن علی نے، انھیں محمد بن العباس نے، انھیں احمد بن معروف نے، انھیں حسین بن الفہم نے، انھیں محمد بن سعید نے، انھیں محمد بن عمر نے مذکورہ بالا اسناد و الفاظ کے ساتھ اس روایت کی اطلاع دی ہے۔

اسنادِ دیگر:

حافظ دارقطنی نے علل الحدیث جلد پنجم میں بیان کیا ہے کہ مجھ سے جعفر بن محمد بن احمد واسطی نے، ان سے ابراہیم بن احمد بن عمر وکیعی نے۔ ان سے ان کے والد نے، ان سے ابوالحسن عکلی نے، ان سے شعبہ بن عمارہ بن غزیہ انصاری نے، ان سے ان کے والد نے، ان سے محمد ابراہیمؒ بن حارث تیمی نے اور ان سے عائشہ نے بیان کیا ہے کہ رسولؐ اللہ جبرئیلؑ کے ساتھ میرے گھر میں تھے۔ آپؐ نے مجھ سے فرمایا کہ کوئی دروازے سے آنے نہ پائے۔ اتفاق سے میں غافل ہو گئی اور حسینؑ بن علیؑ آپؐ کے پاس پہنچ گئے۔ آپؐ نے انھیں سینے سے لگا لیا۔ جبرئیلؑ نے پوچھا یہ آپ کے فرزند ہیں؟ حضرت نے فرمایا بیشک! جبرئیلؑ نے کہا لیکن یہ تو آپ کی اُمت کے ہاتھوں قتل ہوں گے ــــــ یہ سننا تھا کہ

حضرتؐ کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ جبرئیل نے کہا کہ اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو وہ خاک بھی دکھلا دوں جہاں یہ قتل ہوں گے ــــ اور یہ کہہ کر ایک مٹھی سرخ مٹی حضرت کے حوالے کر دی۔

✶ دار قطنی ہی کا بیان ہے کہ مجھ سے حسین بن اسماعیل نے، ان سے احمد بن محمد بن یحییٰ بن سعید نے، ان سے زید بن حباب ابو الحسین نے، ان سے سفیان بن عمارہ انصاری نے، ان سے محمد بن ابراہیم بن الحارث نے، ان سے عائشہ نے بیان کیا ہے ــــ (دار قطنی کا کہنا ہے کہ روایت سعید بن عمارہ میں ان کے والد کا ذکر غیر صحیح ہے جیسا کہ اسنادِ اوّل میں ذکر ہوا ہے۔)

دار قطنی کی پہلی سند کے تمام رجال صحیح و ثقہ ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ جعفر بن محمد بن احمد الواسطی ابو محمد المؤدب البغدادی المتوفی ۳۵۲ھ ــــ خطیب نے آپ کے حالات تاریخ بغداد میں لکھتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ آپ مردِ ثقہ تھے۔ محمد بن ابی الفوارس کا بیان ہے کہ آپ شیخ ثقہ کثیر الحدیث تھے۔ ابن الجوزی نے المنتظم میں بھی آپ کی وثاقت کا اعتراف کیا ہے۔ ابن العماد نے تو نمایاں اہل خیر و معرفت میں شمار کیا ہے۔

۲۔ ابراہیم بن احمد بن عمر ابو اسحاق الوکیعی المتوفی ۲۸۹ھ۔ خطیب نے آپ کے بارے میں تاریخ کے ۶/۵-۶ پر عبداللہ بن احمد سے حکایت کی ہے کہ آپ کے بارے میں علماء کی رائے اچھی ہے اور حافظ دار قطنی سے نقل کیا ہے کہ آپ مرد ثقہ تھے۔

۳۔ احمد بن عمر بن حفص الکندی الوکیعی الجلاب المتوفی ۲۳۵ھ رجالِ مسلم میں ہیں۔ عبداللہ بن احمد اور محمد بن عبدوس نے ثقہ قرار دیا ہے۔ ابن قانع کی نظر میں عبد صالح ثقہ محتاط تھے۔ موسیٰ بن ہارون کی نظر میں بھی مردِ صالح تھے۔ ابن حبان نے ثقات میں شمار کیا ہے۔ یحییٰ بن معین نے ثقہ مانا ہے اور خطیب بغدادی نے تاریخ میں مستقل حالات لکھے ہیں۔

۴۔ زید بن الحباب ابوالحسین عکلی الکوفی المتوفی ۲۰۳ھ۔ صحاح ستہ کے راوی ہیں۔ بخاری نے صحیح میں نہیں لیکن تاریخ میں ان سے روایت کی ہے۔ ابن المدینی عجلی، ابوجعفر السبتی، احمد بن صالح وغیرہ نے توثیق کی ہے اور ابن صالح نے تو صالح و صدوق بھی قرار دیا ہے۔ دار قطنی، ابن ماکولا، عثمان بن ابی شیبہ نے بھی وثاقت کا اعتراف کیا ہے۔ ابن عدی کا کہنا ہے کہ شائح کوفہ کے محتاط افراد میں سے تھے۔ ان کی صداقت میں شک کی گنجائش نہیں ہے۔ خطیب نے بھی کافی تعریفیں نقل کی ہیں۔

۵۔ سعید بن عمارہ۔ علل میں یہ لفظ تین طرح استعمال ہوا ہے: شعبہ بن عمارہ، سفیان بن عمارہ، سعید بن عمارہ ——— لیکن پہلی سند میں صحیح شعبہ عن عمارہ ہے۔ اور دوسری اسناد میں صحیح سفیان عن عمارہ ہے ——— سعید شعبہ کا تحریف شدہ کلمہ ہے۔ دار قطنی نے دوسری سند میں وضاحت کی ہے کہ یہ اپنے والد سے روایت نہیں کرتے ہیں اور یہی صحیح بھی ہے۔ "عَنْ اَبِیْہِ" ان تمام اسناد میں زائد ہے۔

شعبہ اصل میں ابن الحجاج بن الورد العتکی ابوبسطام الواسطی المصری المتوفی ۱۶۰ھ کا نام ہے جو صحاح ستہ کے راوی ہیں۔ ان کی وثاقت متفق علیہ ہے ——— احمد کا خیال ثوری ہے کہ شعبہ، علم رجال وحدیث وتنقید وجرح وتعدیل میں مستقل ایک امت تھے۔ ثوری کا بیان ہے کہ شعبہ، علم الحدیث کے امیر المومنین تھے۔ حاکم کا ارشاد ہے کہ شعبہ، معرفت حدیث کے امام الائمہ تھے۔

۶۔ عمارہ بن غزیہ الانصاری المازنی المدنی المتوفی ۱۴۰ھ۔ بخاری کے علاوہ باقی صحاح ستہ کے راوی ہیں۔ بخاری نے بھی تاریخ میں راوی قرار دیا ہے ——— حافظ ابن حاتم نے ان کے حالات میں لکھا ہے کہ یہ احمد کی نظر میں ثقہ، یحییٰ بن معین کی نظر میں صالح اور ابوزرعہ کی نظر میں موثق تھے۔ ابوحاتم کا کہنا ہے کہ ان کی حدیث میں کوئی حرج نہیں ہے ——— یہ مرد صدوق تھے۔ ابن سعد کے نزدیک ثقہ کثیر الحدیث تھے۔ دار قطنی اور عجلی نے بھی توثیق کی ہے ——— ابن حبان نے تو ثقات ہی میں ذکر کیا ہے۔

۷۔ محمد بن ابراہیم بن الحارث القرشی التیمی ابو عبداللہ المدنی المتوفی ۱۲۰ھ
تابعی اور صحاح ستہ کے راوی ہیں۔ ابن معین، ابو حاتم، نسائی، ابن خراش، ابن سعد، یعقوب بن شیبہ نے توثیق کی ہے۔

دار قطنی کے اسنادِ دیگر:

۱۔ الحسین بن اسماعیل بن محمد اسماعیل ابو عبداللہ الضبی المحاطی المتوفی ۳۳۰ھ
حافظ عراق نے تاریخ میں ان کے یہ حالات لکھے ہیں کہ یہ مردِ فاضل، صادق، متدین تھے۔ ابن الجوزی کا کہنا ہے کہ ان کی مجلس میں دس ہزار آدمی جمع ہوتے تھے۔ انتہائی راست گو، ادیب، فقیہ اور فقہ وحدیث کے سر آمد روزگار تھے۔

۲۔ احمد بن محمد بن یحییٰ بن سعید القطان ابو سعید البصری المتوفی ۲۵۸ھ
ان سے ابن ماجہ اور ابو حاتم نے روایت کی ہے اور ابو حاتم نے صدوق قرار دیا ہے۔ ابن حبان نے ثقہ محتاط تسلیم کیا ہے۔

باقی رجال کا ذکر پہلے ہو چکا ہے صرف سفیان باقی رہ جاتے ہیں۔ یہ سفیان ثوری ہیں جو صحاح ستہ کے راوی ہیں اور جن کے بارے میں کسی کلام کی گنجائش نہیں ہے۔

دونوں اسناد کے رُواۃ کے مآخذ:

الجرح والتعدیل ۱ ق ۱/ ۶۲، ۴۷۔ ۲ ق ۱/ ۳۶۹۔ ۳ ق ۱/ ۳۶۸۔
۲ ق ۲/ ۱۸۴۔

تاریخ بغداد ۴/ ۲۸۴۔ ۶/ ۵۔ ۷/ ۲۳۱۔ ۸/ ۱۹، ۲۳، ۲۴۲۔ ۴۴۴
المنتظم ۶/ ۳۲۷۔ ۷/ ۲۱۔
خلاصہ تذہیب الکمال ص ۱۰۸، ۱۳۸، ۱۴۰، ۲۷۶۔
تہذیب التہذیب ۱/ ۶۳، ۸۰۔ ۴/ ۳۳۸، ۳۴۴۔ ۳/ ۴۰۲، ۴۰۴۔ ۷/ ۴۲۲، ۹/ ۴۰۳۔

شذرات ۳/ ۱۲، ۳۲۶۔
تذکرۃ الحفاظ ۳/ ۴۲

رجال اسنادِ ابنِ سعد:

۱۔ محمد بن عمر بن واقد الواقدی الاسلمی ابو عبد اللہ المدنی القاضی المتوفی ۲۰۷ھ ابراہیم کے نزدیک "اَمِینُ النَّاسِ عَلَی الْاِسْلَام" تھے۔ مصعب زبیری کے نزدیک بے مثل و نظیر تھے۔ داوردی کی نظر میں امیر المومنین فی الحدیث تھے۔ ابی عامر عقدی کا کہنا ہے کہ افسوس لوگ ہم سے واقدی کے بارے میں پوچھتے ہیں حالانکہ واقدی سے ہمارے بارے میں پوچھنا چاہیئے تھا۔ ابراہیم بن جابر فقیہ، صنعانی کا قول نقل کرتے ہیں کہ اگر وہ ہمارے نزدیک ثقہ نہ ہوتے تو ہم ان کو روایت میں بیان نہ کرتے ـــــ ابراہیم حربی نے مصعب زبیری کا قول نقل کیا ہے کہ وہ ثقہ معتمد تھے۔ مثنیٰ نے بھی یہی رائے قائم کی ہے بلکہ ابو یحییٰ ازہری کا بھی یہی خیال ہے۔ ابو عبید نے انھیں ثقہ قرار دیا ہے۔
(واقدی کے بارے میں مخالف اقوال بھی پائے جاتے ہیں۔ اور بعض لوگوں نے انھیں کذّاب تک کہا ہے لیکن اس کی کوئی سند نہیں ہے۔)

۲۔ موسیٰ بن محمد بن ابراہیم بن الحارث التیمی ابو محمد المدنی المتوفی ۱۵۱ھ۔ رجال ترمذی و ابن ماجہ میں ہیں۔ فقیہ محدث کثیر الحدیث ضعیف تھے۔

۳۔ محمد بن ابراہیم تیمی۔ رجال صحاح میں سے ہیں ان کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

۴۔ ابو سلمہ بن عبد الرحمٰن بن عوف الزہری المدنی المتوفی ۹۴ھ۔ صحاح ستہ کے رجال میں ہیں۔ تابعی ثقہ تھے۔ بقول ابن سعد ثقہ فقیہ کثیر الحدیث تھے۔ بقول ابو زرعہ ثقہ امام تھے ـــــ ابن حبان نے بھی ثقات میں شمار کیا ہے ـــــ یہ ساداتِ قریش میں سے تھے۔

ماخذ احوالِ رُواۃ:

طبقات ابن سعد ۵/ ۱۱۵، ۷ ق ۲/ ۷۷

الجرح والتعدیل ابن ابی حاتم ۴ق ۱/ ۲۰، ۱۵۹۔
تاریخ بغداد ۴/ ۴، ۱۲۲۔
تہذیب التہذیب ۹/ ۳۶۲، ۱۰/ ۳۶۸، ۱۲/ ۱۱۵۔۱۱۸۔

رجال اسناد طبرانی:

ابوجعفر احمد بن محمد بن الحجاج بن رشدین المصری المتوفی ۲۹۲ھ۔ حافظ مفری ثقہ تھے۔ بقول ابن یونس حفاظ حدیث اور اہلِ صنعت میں سے تھے۔ مسلمہ بن قاسم کا کہنا ہے کہ مجھ سے ان کی حدیثیں کئی آدمیوں نے بیان کی ہیں۔ وہ ثقہ عالم بالحدیث تھے۔ ان سے محمد بن ابی بکر البزاز، عبداللہ بن جعفر بن الورد، محمد بن الربیع الجیزی، ابوطالب احمد بن نصر الحافظ، جعفر بن محمد المخلدی، احمد بن اسامہ التجیبی، عمر بن عبدالعزیز بن دینار وغیرہ نے روایت کی ہے ــــ ابن ابی حاتم کا بیان ہے کہ میں نے ان کے بارے میں مصر میں شہرت سُنی لیکن ان سے حدیث نہیں لی اس لئے کہ لوگ ان پر اعتراض کر رہے تھے۔ (اس تضعیف و اعتراض کا سبب فضائلِ اہلبیتؑ کی حدیثوں کا بیان کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات کسی رُخ سے باعثِ ضعف نہیں ہوسکتی ہے۔ یہ تو دراصل جماعتی تعصب کی پیداوار ہے جس کی اسلام میں کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔)

۲۔ ابوالحسن عمرو بن خالد التمیمی الحرانی المصری المتوفی ۲۲۹ھ۔ رجال بخاری میں ہیں۔ انھوں نے ان سے ۲۳ حدیثیں لی ہیں۔ عجلی کے نزدیک ثقہ، محتاط تھے۔ دار قطنی کی نظر میں ثقہ، حجت تھے۔ مسلمہ بن قاسم نے توثیق کی ہے۔ ابن حبان نے ثقات میں ذکر کیا ہے۔ ابن ابی حاتم نے الجرح والتعدیل میں نقل کیا ہے کہ ان کے بارے میں میرے والد سے دریافت کیا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ وہ صدوق تھے۔

۳۔ ابن لہیعہ عبداللہ ابوعبدالرحمٰن المصری المتوفی ۱۷۴ھ۔ رجالِ مسلم و ابوداؤد و ابن ماجہ و ترمذی میں ہیں۔ مالک و احمد بن صالح اور ابن شاہین نے توثیق کی ہے۔ دوسرے حضرات نے حافظہ کی داد دی ہے۔ احتیاط و صداقت و صحتِ کتاب کا بھی

اعتراف کیا ہے۔

۴۔ ابوالاسود محمد بن عبدالرحمٰن بن نوفل المدنی یتیم عروہ ۱۳۶ھ کے بعد انتقال کیا۔ صحاح ستہ کے رجال میں ہیں۔ ابوحاتم، نسائی، ابن سعد وغیرہ نے توثیق کی ہے۔

۵۔ عروہ بن الزبیر ابو عبداللہ المدنی المتوفی ۹۱ھ۔ صحاح ستہ کے رجال میں ہیں۔ تابعی ثقہ، محتاط مامون متفق علیہ تھے۔

مصادر رجالِ اسناد :

الطبقات الکبریٰ ۱۳۲/۵۔

الجرح والتعدیل اق ۷۵/۱، ۳ ق ۲۳۰/۱، ۳ ق ۲ /۳۲۰۔

طبقات القراء ۱/ ۱۰۹۔

تہذیب التہذیب ۱۸۰/۷-۱۸۵، ۲۵/۸، ۳۷/۹، ۳۰۸۔

شذرات ۲۰۹/۲۔

لسان المیزان ۲۵۷/۱، ۲۵۸۔

رجالِ اسناد ابن البرقی :

۱۔ سعید بن الحکم المعروف بابن ابی مریم ابو محمد المصری المتوفی ۲۲۴ھ۔ رجال صحاح ستہ میں ہیں۔ ابوحاتم کے نزدیک ثقہ۔ ابن معین کے نزدیک ثِقَۃٌ مِّنَ الثِّقَاتِ، ابوداؤد کی نظر میں حجت، ابن حبان کی نظر میں موثق تھے۔ (تہذیب التہذیب ۱۷/۴، ۱۸)

۲۔ یحییٰ بن ایوب غافقی ابو العباس مصری المتوفی ۱۶۸ھ۔ صحاح ستہ کے رجال میں ہیں۔ ابن معین، بخاری، ابراہیم، حربی وغیرہ نے توثیق کی ہے۔ یعقوب بن سفیان کے نزدیک ثقہ، حافظ تھے۔ دوسرے حضرات نے بھی صدق و صلاح کی تعریف کی ہے۔ (تہذیب التہذیب ۱۸۶/۱۱، ۱۸۸)

۳-۴-۵۔ ابن عزیہ، محمد بن ابراہیم، ابوسلمہ تینوں حضرات صحاح ستہ کے راوی ہیں۔

دیگر مصادرِ حدیث:

* مقتل خوارزمی ۱/۱۵۹ اپنے اسناد سے بیہقی سے، انھوں نے حاکم مستدرک سے، انھوں نے احمد بن علی المقری سے، انھوں نے محمد بن عبدالوہاب سے انھوں نے اپنے والد عبدالوہاب ابن حبیب سے، انھوں نے ابراہیم بن ابی یحیٰی سے انھوں نے عمارہ بن یزید سے، انھوں نے محمد بن ابراہیم التیمی سے، انھوں نے ابو سلمہ سے اور انھوں نے عائشہ سے روایت کی ہے کہ رسولِ اکرمؐ حسینؑ کو اپنی گود میں بٹھائے ہوئے تھے۔ اتفاق سے جبرئیلؑ آ گئے۔ انھوں نے پوچھا یہ آپ کا بچہ ہے؟ آپؐ نے فرمایا بے شک! جبرئیلؑ نے کہا اسے تو آپ کے بعد آپ کی اُمت شہید کر دے گی۔ یہ سُننا تھا کہ حضرتؐ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ جبرئیلؑ نے کہا کہ آپ فرمائیں تو آپ کو وہ زمین بھی دکھلا دی جائے؟ حضرتؐ نے اشتیاق ظاہر کیا تو جبرئیل نے ایک مٹھی خاک کربلا پیش کر دی۔

* مجمع الزوائد ۹/۱۸۷، ۱۸۸۔
صواعق محرقہ ص ۱۱۵ عن ابن سعد والطبرانی مختصراً ثم عن ابن سعد مفصلاً۔
* خصائص سیوطی ۲/۱۲۵، ۱۲۶۔
کنز العمال ۶/۲۲۳۔
جوہرۃ الکلام ص ۱۱۷ عن ابی سعد والطبرانی۔

جنابِ اُمّ سلمہ کے گھر میں دوسری صفِ ماتم

حافظ عبد بن حمید نے اپنی مسند میں عبد الرزاق صنعانی کا یہ بیان درج کیا ہے کہ مجھے عبد اللہ بن سعید بن ابی ہند نے اپنے والد کے حوالے سے خبر دی ہے کہ جناب ام سلمہ فرماتی تھیں کہ ایک دن رسولِ اکرمؐ میرے گھر میں آرام فرما رہے تھے۔ اتفاق سے حسینؑ آگئے۔ میں نے دروازہ پر روک لیا کہ کہیں حضورؐ کی نیند نہ خراب ہو۔ تھوڑی دیر کے بعد میں غافل ہو گئی تو حسینؑ داخلِ حجرہ ہو گئے اور حضورؐ کے سینے پر بیٹھ گئے۔ میں نے حضرتؐ کی آواز سنی تو دوڑ کر پہنچی اور میں نے معذرت کی۔ آپؐ نے فرمایا کہ ابھی جبرئیلؑ آئے تھے۔ وہ مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ کیا آپ اسے دوست رکھتے ہیں؟ میں نے کہا بے شک!۔ تو انھوں نے کہا کہ آپ کی اُمّت اسے قتل کر دے گی۔ کہیئے تو آپ کو خاکِ مقتل بھی دکھا دوں؟ میں نے کہا یقیناً۔ جبرئیلؑ نے پرواز کی اور یہ مٹی لے آئے۔ یہ کہہ کر آپؐ نے سُرخ مٹی دکھلائی اور رونے لگے۔ کاش مجھے معلوم ہوتا کہ تجھے کون قتل کرے گا ـــــ اے حسینؑ!

* حافظ ابو القاسم ابن عساکر نے تاریخ الشام میں بیان کیا ہے کہ مجھے ابو عمر محمد بن محمد القاسم عبشمی، ابو القاسم الحسین بن علی زہری، ابو الفتح مختار بن عبد الحمید، ابو بکر مجاہد بن احمد بوشنجیان، ابو المحاسن اسعد بن علی بن الموفق نے خبر دی ہے کہ ہم سے ابو الحسن عبد الرحمٰن بن محمد داؤدی نے، ان سے عبد اللہ بن احمد بن حمویہ نے، ان سے ابراہیم بن خریم شاشی نے، ان سے عبد بن حمید نے مذکورہ بالا اسناد و الفاظ کے ساتھ روایت کو بیان کیا ہے۔

اس سند کے جملہ رجال، رجالِ صحاح اور ثقات ہیں:

۱۔ عبدالرزاق بن ہمام ابوبکر صنعانی متوفی ۲۱۱ھ صحاح ستہ کے راوی ہیں اور جملہ علماء نے ان کی توثیق کی ہے۔

۲۔ عبداللہ بن سعید بن ابی ہند مولی سمرۃ بن جندب متوفی ۱۱۶ھ۔ صحاح ستہ کے راوی، تابعی ثقہ ہیں۔ عجلی وغیرہ نے ان کی توثیق کی ہے۔

ابن عساکر کے شیوخ:

۱۔ ابو عمر محمد بن محمد بن القاسم بن علی بن محمد بن سعد بن عبداللہ بن محمد بن عمر بن عبدالعزیز عبشمی اموی، حافظ ابن عساکر نے انھیں اپنے شیوخ میں شمار کیا ہے اور ان سے ہرات کی جامع مسجد میں استفادہ کیا ہے۔ (ابن عساکر کے شیوخ کی فہرست میرے کتب خانہ میں موجود ہے۔ (الحمد للہ)

۲۔ ابوالقاسم الحسین بن علی بن الحسین بن علی بن الحسین بن سعد الزہری القرشی۔ ابن عساکر نے انھیں بھی اپنے مشائخ میں شمار کیا ہے۔

۳۔ ابوالفتح مختار بن عبدالحمید بن المنتضی الادیب بوشنجی، حافظ نے بھی ان سے ہرات میں پڑھا ہے اور اپنے مشائخ میں شمار کیا ہے۔ یاقوت حموی نے معجم البلدان میں لکھا ہے کہ یہ ایک شیخ، عالم، ادیب، خطاط تھے۔ جمع و کتابت و تحصیل کے شائق تھے۔ حاکم کنجی کے بعد وفیات الشیوخ کو جمع کیا ہے۔ اپنے نانا ابوالحسن داؤدی سے سماع کیا ہے۔

۴۔ مجاہد بن احمد بن محمد ابوبکر المجاہد بن الطیب المعروف بہ بہ ذل الام بوشنجی۔ ابن عساکر نے انھیں بھی مشائخ میں ذکر کیا ہے اور ان کی حدیث کی تصحیح کی ہے۔

۵۔ ابوالمحاسن اسعد بن علی بن الموفق بن زیاد بن محمد بن ابی القاسم الشافعی الہروی المتوفی ۵۴۲ھ۔ حافظ نے انھیں بھی مشائخ میں شمار کر کے ان کی حدیث کی تصحیح کی ہے۔ ابن العماد کا کہنا ہے کہ یہ حنفی عبدِ صالح تھے۔ دارمی اور داؤدی سے صحیح روایت

کرتے تھے۔ ۸۵ برس کی عمر پائی تھی۔

۶۔ ابوالحسن عبدالرحمٰن بن محمد بن المظفر الداؤدی البوشنجی الشافعی المتوفی ۴۶۷ھ فقیہ محدث شیخ خراسان باعتبار علم و فضل وجلالت و سندیت تھے۔ بوشنج میں تصنیف و تدریس و فتویٰ و موعظہ کی وجہ سے قیام پذیر رہے اور بالآخر شیخ خراسان ہو گئے۔ یاقوت نے انھیں امام سے تعبیر کیا ہے۔ ابن الجوزی نے ان کے دو شعر بھی نقل کئے ہیں:

"اجتماع میں لوگوں کے لئے نورانیت تھی لیکن افسوس کہ وہ نورانیت
چلی گئی اور اندھیرا چھا گیا۔"

"زمانہ اور انسان دونوں فاسد ہو گئے لہٰذا
زمانہ اور انسان دونوں کو میرا سلام"۔

سبکی نے ان کے تذکرہ میں حافظ جرجانی کی تعریف ان الفاظ میں نقل کی ہے۔ اپنے دور کے شیخ، اپنے زمانہ کے یکتا، فقہ و تفسیر و ادب کے ا[illegible] و محتاط، حسن المنظر، خراسان کے بقیۃ المشائخ، عالی الاسناد تھے۔ ۹۲ برس کی عمر پائی تھی۔ ابن شاکر کا بیان ہے کہ معرفت ادب و مذہب میں امام کبیر اور عالی الاسناد تھے۔ ان کے چند شعر بھی نقل کئے ہیں:

"اگر ایسی پاکیزہ زندگی چاہتے ہو جس میں کوئی نزاع نہ ہو تو
قناعت سے کام لو۔ زندگی درحقیقت قانع ہی کی زندگی ہوتی ہے۔"

۷۔ عبداللہ بن احمد بن حمویہ بن یوسف ابو محمد السرخسی المتوفی ۳۸۱ھ۔ بقول ابن العماد محدث ثقہ تھے۔ فربری سے صحیح بخاری کی روایت کی ہے اور عیسیٰ بن عمر السمرقندی سے کتاب دارمی کی اور ابراہیم بن خریم سے مسند عبد بن حمید کی۔ ۸۸ برس کی عمر میں وفات پائی۔

۸۔ ابو اسحاق ابراہیم بن خریم بن قمر الشاشی۔ مسند عبد بن حمید کے راوی و مفسر تھے۔ حفاظ و ائمۂ حدیث و اعلام دین نے مسند و تفسیر مسند میں انھیں سے سب کچھ سیکھا ہے۔ ابن عساکر نے ان کی سند سے ایک حدیث "مشائخ" میں درج کی ہے اور بخاری و

مسلم کے اصول سے اس کی تصحیح کی ہے۔

۹۔ عبد بن حمید بن نصر الکسی المتوفی ۲۴۹ھ۔ رجال مسلم و ترمذی میں ہیں۔ بخاری نے تاریخ میں ان سے روایت لی ہے۔ حافظ و امام و ثقہ تھے۔ اکثر علماء نے توثیق کی ہے۔

مصادر احوال رواۃ :

مشیخہ ابن عساکر مخطوط۔

معجم البلدان ۲/ ۳۰۵، ۷/ ۲۵۱۔ المنتظم ۸/ ۲۹۶۔ طبقات الذہبی ۲/ ۱۰۴۔ النجوم الزاہرہ ۵/ ۹۹۔ تاریخ ابن کثیر ۱۲/ ۱۱۲۔ اللباب ۱/ ۴۰۷۔ طبقات السبکی ۳/ ۲۲۸۔ فوات الوفیات لابن شاکر ۱/ ۵۴۸۔ تہذیب التہذیب ۶/ ۴۵۵۔ شذرات الذہب ۲/ ۱۲۰، ۳/ ۱۰۰، ۳۲۷، ۴/ ۱۳۸۔ ہدایۃ العارفین بغدادی ۲/ ۴۲۳، ۵۱۷۔ معجم المولفین ۵/ ۱۹۲، ۱۱/ ۲۱۱۔

بقیہ مصادر حدیث :

ذخائر العقبیٰ ص ۱۴۷ بحوالۂ بغوی۔

الفصول المہمہ للمالکی ص ۱۵۴ بحوالۂ بغوی۔

تذکرۂ ابن جوزی ص ۱۴۲۔

الصراط السویّ ص ۹۴ مخطوط بحوالۂ مسند عبد بن حمید۔

جوہرۃ الکلام ص ۱۱۷ بحوالۂ عبد بن حمید و عبد اللہ بن احمد۔

اُمّ المومنین زینب بنت جحش کے گھر صفِ ماتم

حافظ ابو یعلیٰ موصلی نے اپنی مسند میں نقل کیا ہے کہ مجھ سے عبد الرحمٰن بن صالح نے، ان سے عبد الرحیم بن سلیمان نے، ان سے لیث بن ابی سلیم نے، ان سے جریر بن الحسن العبسی نے، ان سے غلام زینب نے، ان سے زینب نے بیان کیا کہ رسولِ اکرمؐ میرے گھر میں تھے اور حسینؑ میرے پاس تھے۔ اچانک میں غافل ہو گئی اور حسینؑ حضورؐ کے پاس پہنچ گئے اور ..... کرنے لگے۔ میں نے اٹھانا چاہا۔ آپ نے فرمایا چھوڑ دو۔ اس کے بعد پانی طلب کر کے کپڑا دھو لیا۔ پھر وضو فرما کے نماز شروع کر دی۔ حسینؑ کو اپنی گود میں لے لیا۔ جب رکوع یا سجدہ فرماتے تھے تو حسینؑ کو بٹھا دیتے تھے، اور پھر حسینؑ رونے لگتے تو اٹھا لیتے۔ نماز کے بعد میں نے عرض کی کہ آج تو آپ نے عجیب و غریب طریقہ اختیار کیا ہے۔ فرمایا جبرئیلؑ نے مجھے خبر دی ہے کہ میری اُمّت اسے شہید کر دے گی۔ میں نے خاکِ تربت کا تقاضا کیا تو انھوں نے ایک سُرخ مٹی بھی مجھے دی ہے۔

٭ حافظ ابن عساکر نے تاریخ الشام میں بیان کیا ہے کہ مجھے ام المجتبیٰ العلویہ نے خبر دی ہے کہ ابو القاسم السلمی کے سامنے یہ روایت اس طرح پڑھی گئی کہ ابو بکر بن المقری سے ابو یعلیٰ نے، ان سے عبد الرحمٰن بن صالح نے انھیں الفاظ و اسناد کے ساتھ روایت کی ہے۔

٭ مجمع الزوائد ۹/ ۱۸۸، اور کنز العمال ۶/ ۲۲۳ پر بھی یہ روایت پائی جاتی ہے۔
روایت کے اسناد میں جملہ رجال ثقات ہیں، صرف ایک میں اختلاف ہے اس لئے کہ اس کے نام میں تغیّر ہو گیا ہے۔ تفصیل یہ ہے:

۱۔ عبدالرحمٰن بن صالح الازدی العتکی ابوصالح الکوفی ثم البغدادی المتوفی ۲۳۵ھ۔

مسطوعی کا بیان ہے کہ عبدالرحمٰن رافضی تھے۔ احمد بن حنبل کے پاس ان کی آمد و رفت کافی تھی۔ ایک مرتبہ لوگوں نے ان پر اعتراض کیا تو انھوں نے جواب دیا۔ سبحان اللہ ایک شخص اہلبیتِ رسولؐ کو دوست رکھتا ہے تو میں اس سے کہہ دوں کہ تم دوست نہ رکھو۔ مردِ ثقہ ہیں۔ یحییٰ بن معین کا بیان ہے کہ ایک شخص کوفی تم سب سے آگے ہے اور وہ عبدالرحمٰن ثقہ، صدوق رافضی ہے۔ اس لئے کہ اس کے نزدیک ایک حرف جھوٹ بولنے سے آسان آسمان سے گر پڑنا ہے ـــــ بریری کا کہنا ہے کہ میں نے یحییٰ بن معین کو ان کی دہلیز میں بیٹھے ہوئے دیکھا ہے۔ ابوحاتم انھیں صدوق سمجھتے ہیں اور موسیٰ بن ہارون کا ارشاد ہے کہ وہ مردِ ثقہ تھے۔ یہ اور بات ہے ازواج و اصحابِ پیغمبرؐ کے عیوب بیان کیا کرتے تھے۔ ابن عدی کا کہنا ہے کہ عبدالرحمٰن کوفہ والوں میں نمایاں شخصیت رکھتے تھے۔ ان پر ضعفِ حدیث کا کوئی الزام نہیں ہے یہ اور بات ہے کہ ان میں تشیع پایا جاتا تھا۔ ابن حبّان نے انھیں ثقات میں شمار کیا ہے۔

۲۔ عبدالرحیم بن سلیمان کنانی ابوعلی المروزی الاشل الکوفی المتوفی ۱۸۷ھ۔

صحاح ستّہ کے رجال میں ہیں۔ ابن معین، ابوداؤد، عثمان ابن ابی شیبہ وغیرہ نے توثیق کی ہے۔ ابوصالح نے صالح الحدیث اور کثیر التصنیف قرار دیا ہے۔

۳۔ لیث بن ابی سلیم بن زنیم القرشی المتوفی ۱۴۱ھ۔ صحاح میں غیر بخاری کے راوی اور تاریخ میں بخاری کے راوی ہیں۔ صدوق اور صاحبِ سنّت ہیں۔ دار قطنی کا بیان ہے کہ یہ صاحبِ سنّت تھے۔ ان کی حدیث نقل کی جائے گی۔ ان پر اعتراض صرف یہ ہے کہ انھوں نے عطا، طاؤس اور مجاہد میں جمع کر دیا ہے۔

۴۔ جریر بن الحسن العبسی۔ اس نام میں تحریف پائی جاتی ہے اس لئے کہ اس نام اور لقب کا کوئی شخص رجال میں نہیں پایا جاتا ہے۔

۵۔ مولیٰ زینب۔ ان کا نام مذکور تھا۔ ان کے طریق سے بہت سی حدیثیں ہیں جنھیں اہلِ مسانید و سنن نے نقل کیا ہے اور ائمہ فقہ و فتویٰ نے مدرک قرار دیا ہے۔ اس سند

میں بعض مقامات پر غلام کے بجائے بعض اہل کا لفظ ہے۔ اس سے مراد محمد بن عبداللہ بن جحش ہیں جو زینب کے بھتیجے تھے۔ ہجرت سے پانچ سال قبل پیدا ہوئے تھے۔ بخاری نے انھیں اصحاب میں شمار کیا ہے۔ ابن حبّان نے ثقات میں ذکر کیا ہے بغوی کا بیان ہے کہ عمر نے اہلِ بدر کی اولاد میں چار ہزار آدمیوں کے نام لکھے تھے جن میں محمد بن عبداللہ بن جحش بھی تھے۔

مصادر احوالِ رواۃ :

تاریخ البخاری الکبیر ۳ ق ۲/۱۰۲، ۴ ق ۱/۲۴۶

الجرح والتعدیل لابن ابی حاتم ۲ ق ۲/۲۴۶، ۹ ۳۳-۳ ق ۲/۱۷۷

طبقات ابن سعد ۶/۲۴۳

تاریخ بغداد ۱۰/۲۶۱، ۲۶۳

الاستیعاب ۱/۳۳۲

اصابہ ۳/۳۵۸

اسد الغابہ ۴/۳۲۲

تہذیب التہذیب ۶/۱۹۷، ۱۹۸، ۳۰۶-۸/۴۶۸، ۹/۲۵۰

جنابِ اُمِّ سلمہ کے گھر میں صفِ ماتم

حافظ ابوالقاسم طبرانی نے المعجم الکبیر میں امام حسینؑ کے حالات میں تحریر فرمایا ہے کہ مجھ سے حسین بن اسحاق شوستری نے، ان سے یحییٰ بن عبدالحمید الحمانی نے، ان سے سلیمان بن بلال نے، ان سے، ان سے کثیر بن زید نے، ان سے مطلب بن عبداللہ بن حنطب نے، ان سے جناب ام سلمہ نے بیان کیا ہے کہ ایک دن رسولِ اکرمؐ میرے گھر تشریف فرما تھے۔ آپ نے فرمایا کہ کوئی شخص میرے پاس آنے نہ پائے۔ میں نگرانی کر رہی تھی کہ اچانک حسینؑ آگئے اور میں نے حضرت کے رونے کی آواز سُنی۔ اب جو دیکھا تو کیا دیکھا کہ حسینؑ حضرت کی گودی میں ہیں اور آپ ان کی پیشانی چوم رہے ہیں۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ میں نے معذرت کی کہ میں نے بچّے کو آتے نہیں دیکھا ہے۔ حضرتؐ نے فرمایا کہ ابھی جبرئیل میرے پاس تھے۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا آپ اسے دوست رکھتے ہیں؟ میں نے اثبات میں جواب دیا تو کہا کہ آپ کی اُمّت اسے کربلا میں شہید کردے گی اور یہ کہہ کر ایک خاک مجھے دکھلائی جو خاکِ مقتل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب حسینؑ کربلا پہنچے اور انھوں نے زمین کا نام پوچھا اور لوگوں نے کربلا بتایا تو انھوں نے فرمایا خدا اور اس کے رسولؐ نے سچ کہا ہے یہ زمین کرب و بلا ہے۔

اس سند کے جملہ رجال ثقہ و معتبر ہیں۔ تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ الحسین بن ابراہیم بن اسحاق شوستری الدقیقی المتوفی ۲۹۰ھ۔ ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں انھیں مشائخِ حدیث میں شمار کیا ہے۔

۲۔ یحییٰ بن عبدالحمید الحمانی ابوزکریا الکوفی المتوفی ۲۲۸ھ مسلم کے رجال میں ہیں۔

حافظ، ثقہ صدوق تھے۔ ابن معین، ابن نمیر، بوشیخی نے توثیق کی ہے۔ بہت سے علماء نے صدوق قرار دیا ہے۔ ابن معین کہتے ہیں کہ یہ ثقہ تھے لیکن اہلِ کوفہ ان سے حسد کرتے تھے۔

۳۔ سلیمان بن بلال التیمی القرشی المتوفی ۱۷۷ھ۔ صحاح ستہ کے رجال میں ہیں۔ احمد، ابن سعد، خلیلی، ابن عدی وغیرہ نے توثیق کی ہے۔

۴۔ کثیر بن زید الاسلمی ابو محمد المدنی المتوفی ۱۵۸ھ۔ اکثر صحاح کے راوی ہیں۔ ابن عمار نے توثیق کی ہے۔ ابن حبان نے ثقات میں ذکر کیا ہے۔ اکثر علماء نے صالح قرار دیا ہے اور ابو زرعہ نے صدوق ٹھہرایا ہے۔

۵۔ المطلب بن عبداللہ بن حنطب مخزومی۔ رجال صحاح میں اور تابعی تھے۔ ابو زرعہ، دار قطنی، یعقوب بن سفیان نے توثیق کی ہے اور ابن حبان نے ثقات میں ذکر کیا ہے۔

مصادر احوال رواۃ:

طبقات ابن سعد ۵/۳۱۱

تاریخ البخاری الکبیر ۲ ق ۲/۵، ۴/۶۱۶۔ ۴ ق ۲/۷۔ ۴ ق ۱۶۸، ۱۷۰

تاریخ بغداد ۱۴/۱۶۷، ۱۷۷

تذکرۃ الحفاظ ذہبی ۲/۱۰

تہذیب التہذیب ۴/۱۷۵۔ ۸/۴۱۳۔ ۱/۱۷۸۔ ۱۱/۲۴۳، ۲۴۹

شذرات الذہب ۱/۲۸۱۔ ۲/۶۷

بقیہ مصادر حدیث:

نظم الدرر ص ۲۱۵ کے الفاظ یہ ہیں:

"پیغمبرؐ میرے یہاں تشریف لائے اور فرمایا دروازے پر نظر رکھو کوئی آنے نہ پائے۔ اتنے میں میں نے آپ کے رونے کی آواز سنی۔ دروازہ کھول کر داخل ہوئی تو دیکھا کہ حسینؑ سامنے بیٹھے ہیں۔ میں نے معذرت کی کہ یا حضرت، میں نے انھیں آتے ہوئے

نہیں دیکھا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ ابھی جبرئیل میرے پاس آئے تھے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ عنقریب آپ کی اُمت اسے کربلا میں شہید کر دے گی۔ اگر کہئے تو آپ کو خاکِ مقتل بھی دکھادوں۔ یہ کہہ کر ایک مُشتِ خاک مجھے دکھلائی ہے" حضرتؐ نے وہ خاک مجھے دے دی۔ میں نے ایک شیشے میں محفوظ کر لی۔ اب جو روزِ عاشور دیکھا تو وہ خاک خون میں تبدیل ہو چکی تھی۔

★ مجمع الزوائد ۹/۱۸۸، ۱۸۹ (صاحبِ مجمع کا کہنا ہے کہ اسے طبرانی نے کئی سندوں سے نقل کیا ہے لیکن ایک سند کے رواۃ موثق ہیں۔)

کنز العمال ۶/۲۲۳ بحوالہ طبرانی، الصراط السوی وغیرہ۔

جنابِ اُمِّ سلمہ کے گھر میں ایک اور صفِ عزا

حافظ ابوالقاسم طبرانی نے معجم کبیر میں تحریر فرمایا ہے کہ مجھ سے بکر بن سہل الدمیاطی نے، ان سے جعفر بن مسافر التینسی نے، ان سے ابن ابی فدیک نے، ان سے موسیٰ بن یعقوب الزمعی نے، ان سے ہاشم بن ہاشم بن عتبہ بن وقاص نے، ان سے عبداللہ بن وہب بن زمعہ نے اور ان سے جنابِ اُمِّ سلمہ نے بیان کیا ہے کہ ایک دن رسولِ اکرمؐ آرام فرما رہے تھے۔ اچانک آپ کی آنکھ کھل گئی۔ آپ سخت پریشان تھے اور آپ کے ہاتھ میں ایک سُرخ مٹی تھی، جسے گردش دے رہے تھے۔ میں نے پوچھا حضورؐ یہ مٹی کیسی ہے؟ فرمایا، جبرئیلؑ نے مجھے خبر دی ہے کہ میرا حسینؑ عراق میں شہید ہوگا۔ میں نے جبرئیلؑ سے اس زمین کو دیکھنے کی خواہش کی تو انھوں نے یہ مٹی دی ہے۔

٭ حافظ حاکم ابوعبداللہ نیشاپوری نے مستدرک ۴/۳۹۸ پر تحریر فرمایا ہے کہ مجھے ابوالحسین علی بن عبدالرحمٰن شیبانی نے کوفہ میں، انھیں احمد بن حازم غفاری نے، انھیں خالد بن مخلد قطوانی نے، انھیں موسیٰ بن یعقوب زمعی نے، انھیں ہاشم بن ہاشم بن عتبہ بن ابی وقاص نے۔ انھیں عبداللہ بن وہب بن زمعہ نے اور انھیں حضرت اُمِّ سلمہ نے خبر دی ہے کہ رسولِ اکرمؐ ایک شب سونے کے لئے لیٹے۔ تھوڑی دیر کے بعد پریشانی کے عالم میں چونک پڑے۔ پھر لیٹے اور پھر چونک پڑے۔ تیسری مرتبہ پھر لیٹے تو اب جو اُٹھے تو ہاتھ میں ایک سُرخ مٹی لئے ہوئے تھے اور اسے بوسہ دے رہے تھے۔ میں نے عرض کی یا رسولؐ اللہ! یہ مٹی کیسی ہے؟ فرمایا، مجھے جبرئیلؑ نے خبر دی ہے کہ میرا حسینؑ ارضِ عراق پر شہید ہوگا۔ میں نے اس خاک کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو جبرئیلؑ نے یہ

خاک دی ہے۔ (حاکم کا تبصرہ یہ ہے کہ یہ حدیث بخاری اور مسلم کے شرائط کی بنا پر صحیح ہے لیکن ان لوگوں نے اپنے یہاں جگہ نہیں دی ہے۔)

★ حافظ ابوبکر بیہقی نے دلائل النبوۃ میں نقل کیا ہے کہ مجھ سے ابوعبداللہ الحافظ حاکم نیشاپوری، ابوبکر احمد بن الحسن القاضی، ابومحمد ابن ابی حامد المقری نے بیان کیا ہے کہ ان سے ابوالعباس محمد بن یعقوب نے، ان سے ہاشم بن ہاشم بن شیبہ بن ابی وقاص نے، ان سے عبداللہ بن وہب بن زمعہ نے اسی سند اور انھیں الفاظ کے ساتھ یہ روایت بیان کی ہے۔

★ حافظ ابن عساکر نے تاریخ الشام میں تحریر کیا ہے کہ مجھے ابویعقوب یوسف بن ایوب بن الحسین نے مرو میں، انھیں محمد بن علی بن محمد بن المہتدی باللہ نے، اور انھیں ابوغالب بن ابی علی نے، انھیں عبدالصمد بن علی نے، انھیں عبیداللہ بن محمد نے، انھیں عبداللہ بن محمد البغوی نے، انھیں علی بن مسلم بن سعید نے، انھیں خالد بن مخلد نے، انھیں ابومحمد موسیٰ بن یعقوب نے انھیں الفاظ و اسناد سے روایت کی خبر دی ہے۔

(ابن عساکر نے اس روایت کو دو سندوں سے اور نقل کیا ہے، جن کے الفاظ میں قدرے فرق ہے لیکن مفہوم سب کا ایک ہے۔)

★ حافظ محمد بن احمد المقدسی الحنبلی نے اپنی کتاب "صفات ربّ العالمین" میں تحریر فرمایا ہے کہ مجھے ابن ابی المنجا نے، انھیں عبدالوہاب بن محمد نے خبر دی ہے کہ ان سے عمر بن محمد نے، ان سے ابوالفتح ابن بیضاوی نے، ان سے ابوجعفر بن المسلمہ نے، ان سے ابوطاہر بن المخلص نے، ان سے عبداللہ بن محمد نے، ان سے علی بن مسلم نے، ان سے خالد بن مخلد نے، ان سے ابومحمد موسیٰ بن یعقوب نے انھیں اسناد و الفاظ سے روایت کی ہے، صرف لفظ حائر کی جگہ خاثر ہے یعنی حضورؐ مضمحل تھے۔

(مقدسی کو ذہبی نے حافظ فقیہ، محدث، ناقد اور امام اوحد کے لفظ سے یاد فرمایا ہے جو ان کی عظمت کے لئے کافی ہے۔ تذکرۃ الحفاظ ص ۱۲۹۰۔ شذرات ۶/۱۴۱)۔

طبرانی کے اسناد قوی اور قابلِ استدلال ہیں:

۱۔ بکر بن سہل بن اسماعیل بن نافع ابومحمد دمیاطی مولیٰ بنی ہاشم متوفی ۲۸۹ھ۔

یاقوت نے معجم البلدان میں تحریر فرمایا ہے کہ انھوں نے دمشق میں صفوان بن صالح سے، بیروت میں سلیمان بن ابی کریمہ بیروتی سے، مصر میں ابوصالح عبداللہ بن صالح کاتب اللیث اور عبداللہ بن یوسف التنیسی سے سماع حدیث کیا ہے اور ان سے ابوالعباس الاصم، ابوجعفر طحاوی اور طبرانی وغیرہ نے روایت کی ہے۔ ۱۹۶ھ میں پیدا ہوئے۔ اکثر کتب رجال میں ان کے حالات ملتے ہیں۔

۲۔ جعفر بن مسافر بن راشد تینسی ابوصالح الہذلی متوفی ۲۵۴ھ۔ رجال ابوداؤد و نسائی و ابن ماجہ میں ہیں۔ شیخ ثقہ صالح ہیں۔ ابن حبّان نے ثقات میں ذکر کیا ہے۔

۳۔ محمد بن اسماعیل بن مسلم ابی فدیک مدنی متوفی ۲۰۰ھ۔ صحاح ستّہ کے رجال میں ہیں۔ ابن معین نے توثیق کی ہے اور ابن حبّان نے ثقات میں ذکر کیا ہے۔

۴۔ موسیٰ بن یعقوب بن عبداللہ زمعی مدنی۔ ابوداؤد، نسائی، ترمذی، ابن ماجہ کے راوی صحاح ہیں۔ بخاری کے راوی الادب المفرد ہیں۔ ابن معین و ابن القطان نے توثیق کی ہے۔ ابن حبّان نے ثقات میں ذکر کیا ہے۔

۵۔ ہاشم بن ہاشم بن عتبہ بن ابی وقاص زہری مدنی متوفی ۱۴۴ھ صحاح ستّہ کے رجال میں ہیں۔ ابن معین، نسائی، عجلی وغیرہ نے توثیق کی ہے۔

۶۔ عتبہ بن عبداللہ (یا بقول حاکم و بیہقی وغیرہ) عبداللہ بن وہب بن عتبہ بن زمعہ اسدی۔ ترمذی، ابن ماجہ کے رجال میں ہیں۔ ابن حبّان نے ثقات میں ذکر کیا ہے۔ ابن معین اور ابن ابی حاتمؒ نے توثیق کی ہے۔

اسنادِ حاکم صحیح ہیں:

۱۔ علی بن عبدالرحمٰن بن عیسیٰ بن زید بن ماتی ابوالحسین الکاتب الشیبانی الکوفی ـــــ بغداد آکر احمد بن حازم بن ابی غرزہ انصاری سے روایت کی ہے۔ ۹۸ سال کی عمر میں ۳۴۷ھ میں وفات پائی ہے۔ حافظ بغدادی نے ان کے مفصّل حالات لکھتے ہوئے انھیں ثقہ قرار دیا ہے۔ ابن الجوزی نے بھی المنتظم میں توثیق کی ہے۔

۲۔ ابو عمرو احمد بن حازم بن ابی غرزہ الغفاری الکوفی المتوفی ۲۷۶ھ۔ ابن حبان نے ان کا ذکر ثقات میں کیا ہے اور انھیں محتاط قرار دیا ہے۔ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کی ایک حدیث نقل کر کے اسے صحیح الاسناد قرار دیا ہے۔

۳۔ خالد بن مخلد القطوانی (کوفی) ابوالہیثم البجلی المتوفی ۲۱۳ھ صحاح ستہ کے رجال میں ہیں۔ عثمان بن ابی شیبہ نے ثقہ صدوق قرار دیا ہے۔ ابن شاہین اور ابن حبان نے ثقات میں ذکر کیا ہے۔ عجلی کا خیال ہے کہ یہ ثقہ تھے لیکن ان میں تھوڑا سا تشیع بھی تھا۔ اور یہ کثیر الحدیث بھی تھے۔ صالح جزرہ کا بیان ہے کہ حدیث میں ثقہ تھے لیکن عقیدہ میں غلو سے متہم تھے۔ ابن سعد کا کہنا ہے کہ حد درجہ کے شیعہ تھے۔ ان کی حدیث ضرورتاً لکھ لی گئی ہے۔

(اہل نظر انصاف کریں کہ علمار رجال میں اس شخصیت کے بارے میں کس قدر تضاد ہے۔ ایک گروہ تشیع کا ذکر کرتا ہے، دوسرا غلو کا الزام دیتا ہے، تیسرا حد درجہ کا شیعہ قرار دیتا ہے۔ کیا ایسے تعصب آمیز نعروں کا بھی کوئی اثر ہو سکتا ہے؟ خدا جانے وہ کون سی ضرورت تھی جس نے ان کی روایت لینے پر مجبور کر دیا؟ ہاں وہ موصوف کی وثاقت و دیانت و امانت و سنت سے واقفیت ہی ہو سکتی ہے۔)

شیوخ بیہقی:

۱۔ الحاکم محمد بن عبد اللہ ابو عبد اللہ الحافظ النیشاپوری ابن البیع المتوفی ۴۰۵ھ۔ ان کی وثاقت پر بقول خطیب و ذہبی و ابن کثیر وغیرہ اتفاق امت ہے۔

۲۔ القاضی ابوبکر احمد بن الحسن بن احمد الحرسی النیشاپوری الحیری نسعی المتوفی ۴۲۱ھ ۹۶ سال کی عمر پائی۔ رئیس محتشم اور امام فقہ تھے۔ ہر سند عالی ان تک منتہی ہوتی ہے۔

۳۔ ابو محمد الحسن بن حامد بن الحسن بن حامد البغدادی الادیب المتوفی ۴۰۷ھ۔ یہ صدوق قلیل الحدیث تھے۔ ابن الجوزی نے المنتظم میں سن وفات ۳۸۵ھ قرار دیا ہے، لیکن اصل قول اوّل ہے جسے خطیب نے تاریخ بغداد میں لکھا ہے

اس لئے کہ ابن الجوزی نے سارے حالات انھیں سے لئے ہیں۔

۴۔ ابوالعباس محمد بن یعقوب الاصم نیشاپوری المتوفی ۳۴۶ھ۔ حافظ امام ثقہ محدث الشرق تھے۔ بقول حاکم اسلام میں ۷۶ سال حدیث بیان کی ہے اور ان کی صداقت اور صحت سماعت میں کوئی اختلاف نہیں ہوا۔ امام الائمہ بن خزیمہ نے توثیق کی ہے اور ابن حاتم نے صدوق ثقہ قرار دیا ہے جیسا کہ ذہبی نے تذکرہ میں لکھا ہے۔

شیوخ اسناد ابن عساکر

۱۔ یوسف بن ایوب بن یوسف بن الحسن ابو یعقوب الہمدانی نزیل مرو المتوفی ۵۳۵ھ۔ سخاوی نے اپنے طبقات میں اور ابن الاہدل نے نقل کیا ہے کہ ابو یعقوب فقیہ، زاہد، عالم، عامل، ربانی، صاحب کرامات و مقامات تھے۔ شذرات، النجوم، الزاہرہ، مراۃ الجنان وغیرہ۔

۲۔ ابوالحسین محمد بن علی بن محمد بن عبیداللہ بن المہتدی باللہ العباسی المعروف بہ ابن الغریق المتوفی ۴۶۵ھ۔ ۹۵ برس کی عمر پائی۔ حافظ خطیب کہتے ہیں کہ میں نے ان کی حدیث لکھی ہے۔ یہ فاضل شریف، ثقہ صدوق تھے۔ مدینہ میں قاضی رہے۔ صلاح و عبادت میں مشہور تھے۔ انھیں لوگ راہب بنی ہاشم کہا کرتے تھے۔ ابن تغری بردی کا کہنا ہے کہ صالح عالم، زاہد ثقہ تھے۔ ابن کثیر کا بیان ہے کہ ثقہ متدین، کثیر الصوم والصلوٰۃ تھے۔ علم و عقل وافر کے مالک، تلاوت کے خوگر، رقیق القلب اور مرجع خلائق تھے۔

۳۔ ابوغالب احمد بن علی بن احمد بن البنار البغدادی الحنبلی المتوفی ۵۲۷ھ۔ ۸۲ برس کی عمر پائی۔ مشائخ ابن الجوزی میں تھے جیسا کہ خود انھوں نے المنتظم میں لکھا ہے۔

۴۔ ابوالغنائم عبدالصمد بن علی بن محمد بن المامون الہاشمی العباسی البغدادی المتوفی ۴۶۵ھ۔ ثقہ و شریف و وجیہ و بارعب تھے۔

۵۔ عبیداللہ بن محمد بن محمد بن بطہ ابوعبداللہ العکبری الفقیہ الحنبلی المتوفی ۳۸۷ھ۔ امام کبیر حافظ مصنف تھے۔ سنت میں مبسوط کتاب لکھی ہے۔ عبد صالح، مستجاب الدعوۃ اور صاحب علم و فہم کثیر تھے۔

۶۔ ابو القاسم عبد اللہ بن محمد بن عبد العزیز البغوی المتوفی ۳۱۷ھ۔ ۱۰۳ برس کی عمر پائی (مسند دنیا) حافظ ثقہ تھے۔ بقول خطیب ثقہ، محتاط، صاحب فہم و معرفت تھے موسیٰ بن ہارون سے ان کے بارے میں سوال ہوا تو انھوں نے فرمایا کہ وہ ثقہ صدوق تھے۔ انھیں فوق الثقہ کہا جا سکتا ہے۔ کہا گیا ہے کہ بعض لوگ ان پر معترض ہیں۔ جواب دیا کہ یہ سب حسد ہے۔ ابو بکر محمد بن علی النقاش نے توثیق کی ہے۔ بقول ابن کثیر حافظ ثقہ ضابط تھے۔ ان کی حدیث صحیح کا درجہ رکھتی ہے۔

۷۔ علی بن مسلم بن سعید طوسی متوفی ۲۵۳ھ۔ رجال بخاری، ابو داؤد، نسائی میں ہیں۔ دارقطنی نے توثیق کی ہے اور ابن حبان نے ثقات میں ذکر کیا ہے۔

شیوخ مقدسی :

۱۔ ابن المنجا محمد بن المنجا بن عثمان بن اسعد ابو عبد اللہ التنوخی الدمشقی الحنبلی المتوفی ۷۲۴ھ۔ ثقہ و مفتی تھے۔ تقویٰ و دیانت میں شہرت یافتہ تھے۔ بقول ذہبی امام فقیہ، فہیم صالح، متواضع تھے۔

۲۔ عبد الوہاب بن محمد بن ابراہیم ابو محمد المقدسی الصحراوی المتوفی ۶۹۰ھ۔ ۸۰ برس کی عمر میں انتقال فرمایا۔

۳۔ عمر بن محمد بن معمر موفق الدین ابو حفص ابن طبرزد البغدادی الدارقزی المتوفی ۶۰۷ھ۔ ۹۰ برس ۷ مہینے کی عمر پائی۔ اپنے وقت میں مسند، شیخ الحدیث اور کثیر الروایۃ تھے۔

۴۔ ابو الفتح ابن البیضاوی عبد اللہ بن محمد بن محمد القاضی البیضاوی المتوفی ۵۳۷ھ۔ محدث حاکم اور محتاط انسان تھے۔

۵۔ ابو جعفر ابن المسلمہ محمد بن احمد بن محمد السلمی البغدادی المتوفی ۴۶۵ھ۔ ۹۱ برس کی عمر پائی۔ ثقہ شریف، عالی الاسناد، کثیر السماع، متین الدیانۃ، واسع الروایۃ بزرگ تھے۔

۶۔ ابو طاہر المخلص محمد بن عبد الرحمٰن البغدادی، الذہبی المتوفی ۳۹۳ھ۔ اپنے وقت میں مسند اور ثقہ تھے۔ ۸۸ برس کی عمر پائی تھی۔

۷۔ عبداللہ بن محمد البغوی۔ آپ کا تذکرہ ہو چکا ہے۔

★ حافظ بغوی نے بھی اس روایت کا اخراج کیا ہے جیسا کہ ذخائر العقبیٰ ص ۱۴۷ پر درج ہے۔

★ سیوطی نے خصائص ۲/۲۵ پر اس روایت کو ابن راہویہ، بیہقی اور ابونعیم سے نقل کیا ہے۔

مصادر احوال رواۃ:

تاریخ بخاری الکبیر اق ۱/۳۷ - ۳ ق ۱/۲۱۸ - ۴ ق ۱/۲۹۸ -

طبقات ابن سعد ۵/۳۲۴ -

الجرح والتعدیل اق ۱/۴۸، ۱۰۷، ۹۱۴ - اق ۲/۱۷۵ - ۲ ق ۲/۱۰۸، ۲۱۲ -
۳ ق ۲/۱۸۸ - ۴ ق ۱/۱۹۷ - ۴ ق ۲/۱۰۳ -

تاریخ بغداد ۲/۳۲۲ - ۳/۱۰۸ - ۶/۲۶۳ - ۷/۳۰۷ - ۵/۴۷۳ - ۱۰/۱۱۷، ۳۷۱، ۳۷۵ - ۱۱/۱۰۸ - ۱۲/۲۲ -

المنتظم ۶/۲۸۸، ۳۸۶، ۳۸۹ - ۷/۱۸۱، ۱۹۳، ۱۹۷، ۲۷۴ - ۸/۲۸۰، ۲۸۲ - ۱۰/۳۱، ۶۵، ۷۹، ۹۴، ۱۰۴ -

کامل ابن اثیر ۱۰/۲۰ - ۱۱/۸، ۳۱ -

اللباب ۱/۵۵۶ - ۲/۲۷۲ -

تاریخ ابن عساکر ۳/۲۸۵ - ۶/۱۱۶، ۱۱۷ -

معجم البلدان ۴/۸۸ - ۷/۱۲۷ -

تذکرۃ الحفاظ ۱/۳۶۷ - ۲/۱۵۵، ۲۷۳، ۲۷۶ - ۳/۳۹، ۴۰، ۷۳، ۲۴۲ -

تاریخ ابن کثیر ۱۱/۱۶۳، ۳۵۵ - ۱۲/۱۰۸، ۲۱۱، ۲۱۸ - ۱۳/۶۱ - ۱۴/۱۱۶ -

النجوم الزاہرۃ ۴/۲۰۸ - ۵/۹۰، ۹۴، ۲۶۸، ۲۷۳ - ۶/۲۰۱ -

طبقات السبکی ۳/۳، ۵، ۶۴، ۷۲ -

مرآۃ الیافعی ۳/۸۱، ۲۶۵۔

طبقات القراء ابن جزری ۲/۲۸۳۔

ذیل طبقات لابن الفرج ۲/۳۷۷۔

تہذیب التہذیب ۱/۲۵، ۱۲۹۔ ۲/۱۰۷، ۴۰۳۔ ۳/۱۱۶، ۱۱۸۔ ۶/۶۵، ۷۰، ۱۳۷، ۱۳۹۔ ۷/۳۸۲۔ ۹/۹۱۔ ۱۰/۳۷۸۔ ۱۱/۲۰۔

شذرات الذہب ۲/۲۹، ۲۰۱، ۲۰۶، ۲۷۵، ۳۷۵۔ ۳/۲۲، ۱۲۴، ۱۴۴، ۱۷۶، ۲۱۶، ۳۰۴، ۳۲۳، ۳۳۰۔ ۴/۹۶، ۱۰۲، ۱۱۰، ۱۱۴۔ ۵/۲۶، ۳۳۲۔

جنابِ اُمِّ سلمہ کے گھر صفِ عزا

حافظ کبیر ابوبکر بن ابی شیبہ نے "المصنف" ج ۱۲ میں تحریر فرمایا ہے کہ مجھ سے یعلیٰ بن عبید نے، ان سے موسیٰ الجہنی نے، ان سے صالح بن اربد النخعی نے بیان کیا ہے کہ جناب ام سلمہ نے فرمایا کہ میں دروازے پر بیٹھی تھی اچانک حسینؑ داخل ہو گئے جب میں نے غور کیا تو دیکھا کہ رسولِ مقبولؐ کے ہاتھوں میں کوئی شئے ہے جسے بوسہ دے رہے ہیں اور حسینؑ آپ کے سینے پر سو رہے ہیں۔ میں نے عرض کی یا رسولؐ اللہ! ہم۔ آپ کے دستِ مبارک میں کوئی شئے دیکھی ہے اور حسینؑ کو آپ کے سینے پر سوتے ہوئے دیکھا ہے۔ آپ کے آنسو بہ رہے تھے، آخر یہ ماجرا کیا ہے؟ فرمایا جبرئیل میرے حسینؑ کے مقتل کی خاک لائے تھے اور کہہ گئے ہیں کہ میری اُمت میرے حسینؑ کو شہید کر دے گی۔

حافظ طبرانی نے المعجم الکبیر میں نقل کیا ہے کہ مجھ سے الحسین بن اسحاق التستری نے، ان سے علی بن بحر نے، ان سے عیسیٰ بن یونس نے بیان کیا ہے ـــــ ح مجھ سے عبید بن غنام نے، ان سے ابوبکر بن ابی شیبہ نے ـــــ ان سے یعلیٰ بن عبید نے ـــــ اور عیسیٰ و یعلیٰ سے موسیٰ بن صالح الجہنی نے ـــــ ان سے صالح بن اربد نے اور ان سے جناب اُمِّ سلمہ نے بیان کیا ہے کہ حضورِ اکرمؐ نے مجھ سے فرمایا کہ دروازے پر بیٹھ جاؤ اور کسی کو آنے نہ دینا۔ میں دروازے پر کھڑی تھی۔ اچانک حسینؑ آ گئے۔ میں نے انھیں پکڑنا چاہا لیکن وہ تیزی سے نانا کے پاس پہنچ گئے۔ میں معذرت کی غرض سے دوڑی۔ یا حضرتؐ آپ نے مجھے روکنے کا حکم دیا تھا لیکن حسینؑ میری گرفت میں نہ آسکے اور آپ کے پاس پہنچ گئے ـــــ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ آپؐ کسی شئے کو ہاتھ میں حرکت دے رہے ہیں اور آپؐ کے

آنسو جاری ہیں۔ بچہ آپؐ کے سینے پر ہے۔ آخر یہ قصہ کیا ہے؟ فرمایا، ابھی جبرئیل یہ خبر لائے تھے کہ میری اُمت میرے حسینؑ کو قتل کر دے گی ـــــ اور یہ اس کے مقتل کی خاک ہے جسے میں ہاتھوں میں لئے گردش دے رہا ہوں۔

* حافظ ابن السمان نے اپنے اسناد سے موسیٰ جہنی سے روایت نقل کی ہے اور ان سے حافظ خوارزمی نے مقتل الحسینؑ ۱/۱۵۸ پر نقل کیا ہے۔

ابن ابی شیبہ کی سند صحیح ہے ـــــ اس کے رجال یہ ہیں:

۱۔ یعلیٰ بن عبید بن ابی امیہ الایادی ابو یوسف الطنافسی الکوفی المتوفی ۲۰۹ھ صحاح ستہ کے رجال میں ہیں۔ ابن معین، ابن سعد، دار قطنی وغیرہ نے توثیق کی ہے۔ احمد کا کہنا ہے کہ یہ صحیح الحدیث اور مرد صالح تھے۔

۲۔ موسیٰ بن عبد اللہ الجہنی الکوفی المتوفی ۱۴۴ھ مسلم، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ کے رجال میں ہیں یحییٰ بن سعید القطان، احمد، عجلی، نسائی، ابن سعد وغیرہ نے توثیق کی ہے۔

۳۔ صالح ابن اربد نخعی۔ ابن حاتم نے الجرح والتعدیل میں ان کا ذکر کیا ہے اور کوئی اعتراض وغیرہ نہیں کیا ہے۔ یہی حال بخاری کا تاریخ کبیر کے دو مقامات پر ہے۔

شیوخ طبرانی:

۱۔ الحسین بن ابراہیم بن اسحاق التستری الدقیقی المتوفی ۲۹۰ھ مشائخ حدیث میں ہیں۔ ابن عساکر نے تاریخ میں ان کے حالات درج کئے ہیں۔

۲۔ علی بن بحر بن بری القطان ابو الحسن البغدادی المتوفی ۲۳۴ھ۔ ابو داؤد، ترمذی اور تعلیقاً بخاری کے رجال میں ہیں۔ احمد ابن معین، ابو حاتم، عجلی، دار قطنی، حاکم، ابن قانع وغیرہ نے توثیق کی ہے۔

۳۔ عیسیٰ بن یونس بن اسحاق السبیعی الکوفی نزیل الشام المتوفی ۱۸۷ھ صحاح ستہ کے رجال میں ہیں۔ احمد، ابو حاتم، ابن خراش، یعقوب بن شیبہ، عجلی، ابو ہمام، ابن سعد وغیرہ نے توثیق کی ہے۔

۴۔ عبید بن غنام بن حفص کوفی ابو محمد المتوفی ۲۹۷ھ۔ ابوبکر بن ابی شیبہ کے رواۃ میں ہیں۔ محدث صدوق صاحب خیر ہیں۔

۵۔ ابوبکر ابن ابی شیبہ عبداللہ بن محمد الکوفی المتوفی ۲۳۵ھ۔ ترمذی کے علاوہ صحاح ستہ کے راوی ہیں۔ حافظ ثقہ ہیں۔ عجلی، ابوحاتم، ابن خراش نے توثیق کی ہے۔ ابن حبان نے ثقات میں ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ حافظ محتاط متدین، مصنف و جامع تھے۔ ابن قانع نے ثقہ محتاط قرار دیا ہے۔ ان سے ۱۵۴۰ حدیثیں نقل ہوئی ہیں جن میں ۳۰ بخاری نے نقل کی ہیں۔ (ہمارے پاس ان کی کتاب "المصنف" کے تین نسخے موجود ہیں۔ الحمدللہ)

مصادر احوال رواۃ:

طبقات ابن سعد ۶/۲۴۷، ۲۷۷۔ ۷ق ۲/۵۹، ۱۸۵۔

تاریخ البخاری ۲ق ۲/۲۷۴، ۲۸۹۔ ۳ق ۲/۴۰۶۔ ۳ق ۲/۲۶۳۔ ۴ق ۱/۲۸۸۔ ۴ق ۲/۴۱۹۔

الجرح والتعدیل ۲ق ۱/۳۹۴، ۲ق ۲/۱۶۰، ۳ق ۱/ ۱۷۶۔ ۲۹۱، ۴ق ۱/۱۴۹، ۴ق ۲/۳۰۴۔

تاریخ بغداد ۱۰/۶۶، ۷۱۔

تاریخ ابن عساکر ۴/۲۸۸۔

تذکرہ ذہبی ۲/ ۱۸۔

تہذیب التہذیب ۶/۲، ۴۔ ۷/۲۸۴، ۸/۲۳۷۔ ۱۰/۳۵۴۔ ۱۱/۴۰۲۔

شذرات الذہب ۲/ ۸۵، ۲۲۵۔

اُمّ المومنین عائشہ کے گھر ایک جدید ملک کی آمد پر صفِ عزا

حافظ ابو القاسم طبرانی المعجم الکبیر میں رقم طراز ہیں کہ مجھ سے محمد بن عبد الحضرمی نے، ان سے الحسین بن الحریث نے، ان سے فضل بن موسیٰ نے، ان سے عبداللہ بن سعید نے، ان سے ان کے والد نے اور ان سے حضرت عائشہ نے بیان کیا ہے کہ حسینؑ بن علیؑ پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا کہ اے عائشہ، میں تم کو بالکل نئی بات کی اطلاع دیتا ہوں۔ آج میرے پاس ایک فرشتہ آیا تھا، جو کبھی نہیں آیا تھا اور اس نے مجھے خبر دی ہے کہ میرا یہ فرزند شہید ہوگا بلکہ یہ بھی کہا کہ اگر آپ چاہیں تو آپ کو مقتل کی خاک بھی دکھادوں اور یہ کہہ کر ایک سرخ مٹی بھی دکھائی ہے۔

* امام الحنابلہ احمد نے مسند ۶/۲۹۴ پر بیان کیا ہے کہ مجھ سے وکیع نے، ان سے عبداللہ بن سعید نے، ان سے ان کے والد نے، ان سے حضرت ام سلمہ یا عائشہ نے روایت کی ہے (یہ شبہ عبداللہ بن سعید کی طرف سے ہے کہ حضرتؐ نے یہ بات کس سے کہی تھی) کہ آنحضرتؐ نے فرمایا آج ایک ایسا فرشتہ آیا تھا جو آج تک نہیں آیا تھا اور اس نے کہا ہے کہ آپ کا فرزند حسینؑ شہید ہوگا بلکہ مجھے ایک خاک سرخ بھی دکھلائی ہے کہ یہ خاک مقتل حسینؑ ہے۔

اسناد احمد صحیح ہے اور اس کے رجال صحاح کے رجال ہیں:

۱۔ وکیع بن الجراح ابو سفیان الکوفی المتوفی ۱۹۶ھ۔ صحاح ستہ کے رجال میں ہیں۔ حافظ، امام المسلمین، ثقہ، محتاط، امین، عالی السند، رفیع القدر، حجت، عابد، صالح اور مفتی تھے۔

۲۔ عبداللہ بن سعید بن ابی ہند الفزاری المتوفی ۱۴۷ھ۔ صحاح ستہ کے رجال میں ہیں۔ احمد نے انتہائی ثقہ قرار دیا ہے۔ ابن معین، ابوداؤد، ابن سعد، عجلی، یعقوب بن سفیان، ابن المدینی، ابن البرقی وغیرہ نے توثیق کی ہے۔

۳۔ سعید بن ابی ہند الفزاری مولیٰ سمرہ بن جندب المتوفی ۱۱۶ھ۔ صحاح ستہ کے رجال میں ہیں۔ تابعی ثقہ ہیں۔ عجلی نے توثیق کی ہے۔ ابن حبان نے ثقات میں ذکر کیا ہے۔

اسناد طبرانی بھی صحیح ہے اور اس کے رجال بھی موثق ہیں :

۱۔ محمد بن عبداللہ حضرمی کوفی المعروف بمطین المتوفی ۲۹۷ھ۔ دارقطنی نے ثقہ قرار دیا ہے۔ اکثر علماء نے اس وثاقت کی تائید کی ہے۔

۲۔ الحسین بن الحریث بن الحسن ابو عمار المروزی المتوفی ۲۴۴ھ۔ ابن ماجہ کے علاوہ جملہ صحاح کے راوی ہیں۔ نسائی نے توثیق کی ہے اور ابن حبان نے ثقات میں ذکر کیا ہے۔

۳۔ الفضل بن موسیٰ السینانی ابو عبداللہ المروزی المتوفی ۱۹۱ھ صحاح ستہ کے راوی ہیں۔ اپنے عصر میں امام الحدیث، عالی الاسناد تھے۔ ابن معین، ابن سعد، ابن وکیع وغیرہ نے توثیق کی ہے۔

مصادر حالات :

طبقات ابن سعد ۲۷۵/۶۔ ۲ ق ۱۰۴/۲۔

الجرح والتعدیل ۱ ق ۵۰/۲۔ ۲ ق ۷۱/۱۔ ۲ ق ۷۰/۲۔ ۲ ق ص ۶۸۔ ۴ ق ص ۳۷، ۳۹۔

تاریخ بغداد ۴۶۶/۱۲، ۴۸۱۔

تہذیب التہذیب ۳۳۳/۲۔ ۹۳/۴۔ ۲۳۹/۵۔ ۲۸۶/۷، ۲۸۷۔ ۱۲۲/۱۱، ۱۳۱۔

تذکرۃ الحفاظ ذہبی ۲/ ۲۱۰۔

شذرات ۲/ ۲۲۶۔

* حافظ ابن عساکر نے تاریخ الشام میں اس روایت کو اس سند کے ساتھ نقل کیا ہے۔ ابو نصر، ابو غالب، ابو محمد نے خبر دی ہے کہ ہم سے حسن بن علیؑ نے بیان کیا ہے:

ح: ہمیں ابو القاسم بن الحصین نے، انھیں ابو علی بن المذہب نے خبر دی ہے کہ ہم دونوں کو احمد بن جعفر نے، انھیں عبداللہ بن احمد نے، انھیں ان کے والد نے اسناد و الفاظِ احمد کے ساتھ یہ روایت سنائی ہے۔

* حافظ عراقی نے طرح التثریب ۱/ ۴۱ پر روایت کو درج کیا ہے۔

* حافظ ہیثمی نے مجمع الزوائد ۹/ ۱۸۷ پر روایت احمد نقل کیا ہے۔

* ابن حجر نے صواعق ص ۱۱۵ پر درج کیا ہے۔

* السید محمود المدنی نے الصراط السوی پر احمد کے حوالے سے نقل کرکے روایت کو قطعی قرار دیا ہے۔

اُمّ المومنین عائشہ کے گھر ایک اور صفِ ماتم

ابن سعد صاحب طبقات کبریٰ کا بیان ہے کہ مجھے علی بن محمد نے، انھیں عثمان بن مقسم نے، انھیں مقبری نے اور انھیں عائشہ نے خبر دی ہے کہ حضورؐ آرام فرمارہے تھے۔ اتفاقاً حسینؑ آگئے۔ میں نے انھیں الگ رکھنا چاہا، لیکن جب میں کسی کام سے لگ گئی وہ حضرت کے پاس پہنچ گئے۔ آپ کی آنکھ کھل گئی اور آپ رونے لگے۔ میں نے عرض کی، حضور رونے کا کیا سبب ہے؟ فرمایا، جبرئیل نے مجھے مقتلِ حسینؑ کی خاک دکھلائی ہے اور بتایا ہے کہ اس کے قاتل پر شدید غضبِ خدا ہوگا۔ مجھے بطحا کی ایک مشتِ خاک بھی دی ہے۔ اے عائشہ خدا کی قسم مجھے بے حد رنج ہے کہ میری اُمّت کا آدمی اور میرے حسینؑ کا قاتل بنے۔

یہ سند صحیح اور اس کے رجال مؤثق ہیں:

ا۔ علی بن محمد (طبقات) علی بن جعد (صحیح)، بن عبید الجوہری ابوالحسن البغدادی المتوفیٰ سنہ ۲۳۰ھ۔ ۹۶ برس کی عمر پائی۔ ابوداؤد اور بخاری کے رواۃ میں تھے۔ عثمان بن مقسم اور دیگر ائمہ حدیث سے روایت کرتے تھے۔ ابن معین نے ثقہ صدوق اور عالم ربّانی قرار دیا ہے۔ ابوزرعہ نے صدوق فی الحدیث کہا ہے۔ ابوقاسم نے صدوق محتاط سے تعبیر کیا ہے۔ صالح بن محمد نے ثقہ اور نسائی نے صدوق کہا ہے۔ ابن قانع اور متین نے توثیق کی ہے۔

عبداللہ بن احمد بن حنبل کے بارے میں نقل کیا جاتا ہے کہ ان سے سوال کیا گیا کہ آپ نے علی بن الجعد کی روایتیں کیوں نہیں لیں تو انھوں نے جواب دیا کہ مجھے میرے والد نے ان کی طرف جانے سے روکا تھا۔ انھیں یہ اطلاع ملی تھی کہ ابن الجعد اصحابِ رسولؐ

کی توہین کرتے ہیں ــــ تاریخ کے بارے میں حسب ذیل اعتراضات نقل کئے ہیں۔

(الف) آپ کے سامنے ابن عمر کی یہ حدیث نقل ہوئی کہ ہم لوگ عہد پیغمبرؐ میں خیر اُمت ابوبکر و عمر و عثمان کو کہا کرتے تھے اور حضرتؐ نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ تو آپ نے فرمایا کہ یہ بچہ جسے اپنی بیوی کو طلاق دینے کی تمیز نہیں ہے یہ خیر اُمت کا فیصلہ کرنے چلا ہے۔

(ب) آپ فرمایا کرتے تھے کہ خدا معاویہ پر ہزار عذاب کرے تو مجھے کوئی تکلیف نہ ہوگی۔

(ج) آپ کے سامنے یہ ذکر آیا کہ عثمان نے بیت المال سے ایک لاکھ درہم لے لئے تھے تو ہارون بن سفیان نے کہا کہ ان کا حق رہا ہوگا۔ آپ نے فوراً ٹوک کر فرمایا کہ غلط ہے بالکل ناحق۔

(ظاہر ہے کہ ہر شخص کو اپنی رائے اور عقیدہ میں آزادی ملنی چاہئے۔ پھر آپ کے تینوں اعتراضات تو تاریخی حقائق کی روشنی میں تھے ان پر کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔)

۲۔ عثمان بن المقسم البری ابوسلمہ الکندی۔ ابن مہدی نے انتہائی تہم قرار دیا ہے۔ عمرو بن علی نے صدوق لیکن صاحب بدعت کہا ہے۔ احمد نے بدعقیدہ قرار دیا ہے۔

۳۔ المقبری سعید بن ابی سعید ابوسعد المدنی المتوفی ۱۱۷ھ صحاح ستہ کے راوی ہیں۔ ابن سعد، ابن المدینی، عجلی، ابوذر، نسائی، ابن خراش وغیرہ نے توثیق کی ہے۔

مصادر حالات رواۃ :

طبقات ابن سعد ۵/ ۶۱ - ۷ ق ۲/ ۸۰ -

تاریخ البخاری الکبیر ۲ ق ۱/ ۴۳۴ - ۳ ق ۲/ ۲۵۲، ۲۶۶ -

الجرح والتعدیل ۳/ ۱۶۷، ۱۶۹، ۱۶۸ -

تاریخ بغداد ۱۱/ ۳۶۰، ۳۶۶ -

تہذیب التہذیب ۴/۳۸، ۴۰۔ ۸/۲۸۹، ۲۹۳۔
شذرات ۱/۱۶۳۔ ۲/۶۸۔

✱ حافظ ابن عساکر نے تاریخ الشام میں اسی سے ملتی جلتی حدیث جناب ام سلمہ سے اس طرح نقل کی ہے کہ مجھ سے ابو بکر محمد بن الحسین نے، ان سے ابوالحسین بن المہتدی نے، ان سے ابوالحسن علی بن عمرہ الحربی نے، ان سے احمد بن الحسن بن عبدالجبار نے، ان سے عبدالرحمٰن (بن صالح ازدی) نے، ان سے ابوبکر بن عیاش نے، ان سے موسیٰ بن عقبہ نے، ان سے داؤد نے بیان کیا ہے کہ جناب ام سلمہ فرماتی تھیں کہ ایک مرتبہ حسینؑ رسولؐ اللہ کے پاس آئے تو حضرتؐ رنجیدہ ہو گئے۔ میں نے عرض کی کہ حضورؐ یہ رنجیدہ ہونے کا سبب کیا ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا کہ جبرئیلؑ نے مجھے خبر دی ہے کہ میرا یہ فرزند شہید کیا جائے گا اور اس کے قاتل پر اللہ کا شدید غضب ہو گا۔

امیرالمومنین علیؑ بن ابی طالبؑ کے گھر صفِ ماتم

شریف نسابہ ابوالحسین العبیدلی العقیقی نے اپنی کتاب "اخبار المدینہ" میں امیرالمومنینؑ کے طریق سے حضرتؐ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ رسالت مآبؐ ہمارے گھر تشریف لائے تو ہم نے حضرتؐ کے لئے آب گوشت تیار کیا۔ اُمِّ ایمن نے ایک پیالہ دودھ اور ایک پلیٹ خرما لاکر رکھ دیا۔ ہم لوگوں نے حضرتؐ کے ساتھ کھانا کھایا۔ اس کے بعد حضرتؐ نے وضو فرمایا۔ خود اپنے ہاتھ سے سر، پیشانی اور ہاتھوں کو مسح فرمایا۔ پھر قبلہ رو ہو کر کچھ دعائیں پڑھیں اور سجدہ ریز ہو گئے۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ تین مرتبہ حضرتؐ نے یوں ہی سجدے کئے۔ ہماری ہمت نہ تھی کہ حضرت سے سبب پوچھتے۔ اتفاق سے حسینؑ حضرتؐ کی پشت پر بیٹھ کر رونے لگے۔ تو خود حضرت نے پوچھا میرے ماں باپ قربان بیٹا روتے کیوں ہو؟ عرض کی ناناجان، آج تو وہ طریقہ دیکھا ہے جو آپ نے کبھی نہیں اختیار کیا۔ فرمایا، بیٹا آج تم لوگوں کے بارے میں نئے قسم کی خبر میرے حبیب جبرئیل نے دی ہے کہ تم سب شہید کئے جاؤ گے۔ تمہارے مشہد بھی الگ الگ ہوں گے۔ مجھے اس بات سے انتہائی رنج ہوا اور میں نے تم لوگوں کے لئے دعائے خیر کی۔

اس روایت کو السید محمود الشیخانی نے الصراط السوی میں اخبار المدینہ کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ (الصراط السوی بحمد اللہ میرے پاس موجود ہے) اور اخبار المدینہ ایک قابلِ وثوق تاریخ ہے جس پر اعلامِ دین اور

رجال تالیف نے اعتماد کیا ہے۔ اکثر علماء نے اپنی تالیفات میں اس کے حوالے سے باتیں نقل کی ہیں۔

* حافظ موید خوارزمی نے مقتل الحسین ۲/۱۶۷ میں ابوالقاسم محمود بن عمر زمخشری کے اسناد سے حافظ کبیر ابن سعد السمان اسماعیل بن علی رازی المتوفیٰ ۴۴۵ھ سے ان کے اسناد کے ساتھ امیرالمومنینؑ سے اپنی روایت کو نقل کیا ہے۔

مجمعِ اصحاب میں ماتم

حافظ ابو القاسم طبرانی نے المعجم الکبیر میں نقل کیا ہے کہ مجھ سے الحسن بن العباس الرازی نے، ان سے سلیم بن منصور بن عمار نے، ان سے ان کے والد نے ـــــ ح ـــــ مجھ سے احمد بن یحییٰ بن خالد نے، ان سے عمرو بن بکر بن بکار قعنبی نے، ان سے مجاشع بن عمر نے، اور ان دونوں نے عبداللہ بن عمرو بن العاص سے نقل کیا ہے کہ معاذ بن جبل راوی ہیں کہ ایک دن رسول اکرمؐ ہم لوگوں کے پاس تشریف لائے تو آپ کے چہرے کا رنگ متغیر تھا۔ فرمایا، میں محمد ہوں۔ مجھے اللہ نے ہر کام کے آغاز و انجام کا علم دیا ہے۔ جب تک میں تمہارے درمیان رہوں میری اطاعت کرو ـــــ اور جب میں اُٹھ جاؤں تو کتابِ خدا سے تمسک کرو۔ اس کے حلال کو حلال اور اس کے حرام کو حرام سمجھو۔ تمہارے پاس موت بھی آئی ہے اور راحت بھی۔ یہ اللہ کا قدیم نوشتۂ تقدیر ہے۔ تمہارے پاس سیاہ رات کی طرح فتنے آئے ہیں۔ جب رسولوں کا ایک سلسلہ ختم ہوا تو دوسرا شروع ہو گیا۔ نبوتیں فسخ ہو گئیں۔ ملوکیت قائم ہو گئی۔ خدا اس پر رحم کرے جو اسے حق کے ساتھ اختیار کرے اور اسی طرح اس سے نکل جائے جیسے داخل ہوا تھا۔

معاذ ٹھہرو اور شمار کرو ـــــ! معاذ کہتے ہیں کہ جب میں پانچویں بادشاہت تک پہنچا تو حضرتؐ نے فرمایا، یزید۔ خدا یزید کو برکت نہ دے۔ اور یہ کہہ کر آپ کے آنسو جاری ہو گئے ـــــ پھر فرمایا، مجھے حسینؑ کی سنانی سنائی گئی ہے۔ ان کی خاکِ تربت دکھلائی گئی ہے۔ ان کے قاتل کا پتہ بتایا گیا ہے۔ خدا کی قسم جس قوم کے سامنے وہ

شہید ہوگا اور وہ اس کی مدد نہ کرے گی، خدا اس کے سینہ و دل میں اختلاف پیدا کردے گا۔ اس پر اشرار کا غلبہ ہوگا اور وہ تفرقہ کا شکار ہو جائے گی ـــــ اس کے بعد فرمایا ـــــ ہائے فرزندانِ آلِ محمد! ہر ایک کے بعد دوسرا اس کا جانشین ہوگا اور سب کے سب شہید کئے جائیں گے۔

انتباہ:

حافظ ابن عساکر نے اس حدیث کو اپنی تاریخ الشام میں عبداللہ بن عمرو سے روایت کیا ہے اور حافظ سیوطی نے جامع کبیر ۶/۲۲۲ پر اس کا ایک حصّہ نقل کیا ہے لیکن اس میں یہ الفاظ ہیں "خدا یزید طعنہ زن" ملعون کو برکت نہ دے۔ مجھے میرے چہیتے فرزند حسینؑ کی سنانی سنائی گئی ہے۔ ان کی خاکِ قبر دی گئی۔ ان کے قاتل کو دکھایا گیا ہے۔ جس قوم کے سامنے میرا حسینؑ شہید ہوگا اگر وہ اس کی نصرت نہ کرے گی تو اس پر عذاب نازل ہو جائے گا۔

حافظ خوارزمی نے مقتل الحسینؑ ص ۱۶۰۔۱۶۱ پر طبرانی سے دونوں سندوں سے مکمّل حدیث نقل کی ہے۔

پہلی سند حسن اور قابلِ استدلال ہے:

۱۔ الحسن بن العبّاس بن ابی مہران الرازی ابو علی المقری المعروف بہ الجمال البغدادی المتوفیٰ ۲۸۷ھ۔ حافظ بغدادی نے ان کے حالات میں لکھا ہے کہ مردِ ثقہ تھے۔ ابن الجزری نے طبقات میں تحریر کیا ہے کہ یہ شیخ عارف حاذق ثقہ تھے۔ ضبطِ حدیث میں ان سے آگے کوئی نہ تھا۔

۲۔ سلیم بن منصور بن عمار ابوالحسن المروزی نزیل بغداد۔ حافظ نے تاریخِ بغداد میں ان کے حالات میں مشائخ کا شمار کرنے کے بعد لکھا ہے کہ ابن ابی حاتم کے قول کے مطابق ان کے والد بھی ان سے روایت کرتے تھے ـــ اور جب ابن ابی حاتم نے

ان سے کہا کہ اہل بغداد سلیم کے بارے میں بہت کچھ کہتے ہیں تو انھوں نے فرمایا خاموش! میں نے ابن ابی الثلج سے ان کے بارے میں لوگوں کے اس اعتراض کی حقیقت پوچھی تھی کہ انھوں نے ابن ابی علیہ سے بچپنے میں روایتیں لی تھیں تو انھوں نے فرمایا کہ بالکل غلط ہے اور وہ لوگوں سے زیادہ سن تھے۔ (ظاہر ہے کہ یہ کلمہ وثاقت وصحت حدیث وصداقت کا ضامن ہے۔)

۳۔ منصور بن عامر بن کثیر ابو السری السلمی الواعظ نزیل بغداد صاحب المواعظ۔ خطیب نے تاریخ میں ان کے یہ حالات لکھے ہیں کہ انھوں نے مصر جاکر وہاں لوگوں سے باتیں بیان کرنا شروع کیں۔ تو لیث کو ان کی فصاحت بہت پسند آئی۔ انھوں نے اس سے کہا کہ آپ اس شہر میں کیوں تشریف لائے ہیں؟ منصور نے جواب دیا کہ مجھے ایک ہزار دینار کی طلب تھی۔ لیث نے کہا اتنی رقم تو آپ کے حسن کلام پر آپ کو ملے گی لیکن اسے خرچ نہ کیجئے گا۔ یہ کہہ کر آپ نے ایک ہزار دینار انھیں دیدئیے اور ان کی اولاد کو بھی ایک ہزار دینار دئیے —— وہ وہاں سے چلے آئے اور بغداد میں سکونت پذیر ہو گئے اور وہیں انتقال فرمایا۔

ظاہر ہے کہ ابو اللیث بن سعد کی اس قدر توجہ دلیل ہے کہ منصور میں کس قدر صداقت واستقامت پائی جاتی تھی اس لئے کہ خود لیث کے بارے میں خلیلی کا خیال ہے کہ وہ بلاشبہ امام وقت تھے۔ ابن ابی مریم کا کہنا ہے کہ خلق خدا میں لیث سے بہتر انسان میں نے نہیں دیکھا ہے۔ اللہ سے قریب ہونے کی کوئی خصلت ایسی نہیں ہے جو لیث میں نہ پائی جاتی ہو۔ یہ فقیہ، صدوق، ثقہ، محتاط اور سادات اہل زمانہ میں تھے۔

۴۔ عبداللہ بن لہیعہ ابو عبدالرحمٰن المصری المتوفی ۱۷۴ھ۔ مسلم، ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ کے رجال میں ہیں۔ ہم نے الغدیر میں مسند ابن عباس کے ذیل میں ان کے مفصل حالات لکھ کر یہ ثابت کیا ہے کہ یہ مرد متقی، ثقہ صحیح الکتاب تھے۔ کثرت حدیث، ضبط کلام میں ان کا کوئی مثل نہ تھا۔

۵۔ ابو قبیل حی بن ہانی بن ناضر المعافری المصری المتوفی ۱۲۸ھ۔ ترمذی، نسائی اور

الادب المفرد میں۔ بخاری کے راوی ہیں۔ احمد، ابن معین، ابوزرعہ، احمد بن صالح، فسوی، عجلی وغیرہ نے توثیق کی ہے۔

۶۔ عبداللہ بن عمرو بن العاص ابو محمد القرشی المتوفی ۶۳ھ۔ صحابی عظیم، رجال صحاح ستہ میں تھے۔ عبادت گذار اور علامہ تھے۔

مصادر حالات:

تاریخ البخاری الکبیر ۲ ق ۱/ ۷۰، ۳ ق ۱/ ۱۸۲۔

الجرح والتعدیل ۱ ق ۲/ ۲۷۵، ۲ ق ۲/ ۵۴۔۱۴۸، ۴ ق ۱/ ۱۷۶۔

تاریخ بغداد ۷/ ۳۹۷، ۹/ ۴۴۲، ۱۲/ ۷۱۔ ۷۹۔

طبقات القراء ۱/ ۲۱۶۔

تہذیب التہذیب ۳/ ۷۲، ۵/ ۳۳۷، ۳۷۳، ۳۷۹۔

مجمعِ اصحاب میں صفِ عزا

حافظ ابوبکر بن ابی شیبہ نے "المصنّف" کی بارہویں جلد میں تحریر فرمایا ہے کہ مجھے معاویہ بن ہشام نے، ان سے علی بن صالح نے، ان سے یزید بن زیاد نے، ان سے ابراہیم نے، ان سے علقمہ نے، ان سے عبداللہ بن مسعود نے بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ ہم لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ اتفاق سے بنی ہاشم کا ایک گروہ آتا دکھائی دیا؟ پیغمبرؐ اسلام نے جیسے ہی ان لوگوں کو دیکھا آپ کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور چہرے کا رنگ بدل گیا۔ میں نے عرض کی حضورؐ، یہ آپ کے چہرے سے حزن کے آثار کیوں نمایاں ہیں؟ فرمایا، ہم اہلبیتؑ وہ ہیں کہ جن کے لئے اللہ نے آخرت کو دنیا پر مقدم کیا ہے۔ میرے اہلبیتؑ میرے بعد بلاء، دربدری اور غریب الوطنی کا شکار ہوں گے یہاں تک کہ ایک قوم مشرق کی طرف سے سیاہ پرچم لے کر اٹھے گی۔ وہ اپنے حق کا مطالبہ کرے گی اور اسے نہ ملے گا تو وہ لوگ جنگ کریں گے اور اس طرح انھیں ان کا حق مل جائے گا لیکن وہ اسے قبول نہ کریں گے بلکہ میرے اہلبیتؑ میں سے ایک شخص کے حوالے کردیں گے جو دنیا کو عدل وانصاف سے ویسے ہی بھردے گا جیسے لوگ ظلم وجور سے بھر چکے ہوں گے۔ تم میں سے جو بھی اس دور میں رہے وہ اس تک ضرور پہنچے چاہے برف پر کیوں چلنا پڑے۔

★ حافظ ابن ماجہ نے "السنن الصحیح" ۲/۵۱۸ پر خروجِ مہدی کے باب میں معاویہ بن ہشام سے اسی سند کے ساتھ روایت نقل کی ہے۔

★ حافظ ابوجعفر عقیلی نے یزید بن ابی زیاد کے حالات میں یہ روایت نقل کی ہے لیکن اس کے الفاظ یہ ہیں کہ ابن مسعود نے کہا "یا حضرتؐ ہم آپ کے چہرے

پر آثارِ حزن کو پسند نہیں کرتے ہیں۔

★ حاکم نے مستدرک ۴/۴۶۴ پر اسی سند سے روایت کی ہے لیکن اس کے الفاظ یہ ہیں:

"ہم لوگ آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ ہشاش بشاش گھر سے باہر تشریف لے آئے۔ جو ہم نے پوچھا اس کا جواب دیا۔ ہم چُپ ہو گئے تو خود سے مسائل بیان فرمائے۔ لیکن جیسے ہی بنی ہاشم کی ایک جماعت جس میں حسنؑ و حسینؑ بھی تھے، نظر پڑی۔ انھیں گلے سے لگا کر رونے لگے۔ ہم نے عرض کی، یا رسول اللہ! یہ آپ کے چہرے پر آثارِ غم کیوں طاری ہیں؟ فرمایا خداوند عالم نے ہم اہلبیتؑ کے لئے آخرت کو دنیا پر مقدّم کیا ہے۔ میرے اہلبیتؑ میرے بعد دربدری اور غریب الوطنی میں مبتلا ہوں گے۔"

★ حافظ ابو نعیم اصفہانی نے اخبار اصفہان نے ۲/۱۲ پر اسی سند سے روایت کی ہے۔

★ حافظ طبرانی نے المعجم الکبیر جلد ثالث پر اسی سند سے روایت کی ہے، صرف اس کے الفاظ یہ ہیں:

"جب حضرتؐ کے سامنے سے اہلبیتؑ کی کوئی جماعت گذرتی تھی تو آپ کے چہرے کا رنگ بدل جاتا تھا۔ ایک دن ایسا ہی ہوا تو ہم لوگوں نے عرض کی حضورؐ، اس حزن و الم سے ہم لوگوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ آپ کے اہلبیتؑ اور آپ انھیں دیکھ کر رنجیدہ ہو جاتے ہیں؟ فرمایا میرے اہلبیتؑ کے لئے خداوند عالم نے آخرت کو پسند کیا ہے دنیا کو نہیں پسند کیا ہے۔ (یہاں ان کے حالات قابلِ رنج و الم ہیں۔)"

اس کے علاوہ اور دیگر اعلامِ حدیث نے بھی اس روایت کو اپنی تالیفات میں جگہ دی ہے۔

اسناد ابن ابی شیبہ:

۱۔ معاویہ بن ہشام القصار ابو الحسن الکوفی المتوفی ۲۰۴ھ۔ بخاری کے علاوہ صحاح ستہ

کے راوی ہیں۔

۲۔ علی بن صالح ابو محمد الہمدانی الکوفی المتوفی ۱۵۱ھ۔ صحاح کے راوی ہیں۔ تمام علماء نے توثیق کی ہے۔

۳۔ یزید بن ابی زیاد القرشی ابو عبد اللہ الکوفی المتوفی ۱۳۶ھ۔ صحاح ستہ کے راوی اور ثقہ عادل ہیں۔

۴۔ ابراہیم بن یزید نخعی کوفی المتوفی ۹۶ھ۔ صحاح ستہ کے راوی فقیہ کبیر ہیں۔ ان کی وثاقت متفق علیہ ہے۔

۵۔ علقمہ بن قیس النخعی المتوفی ۶۲ھ۔ تابعی اور صحاح ستہ کے راوی ہیں۔

اسناد عقیلی:

۱۔ محمد بن اسماعیل ابو اسماعیل الترمذی المتوفی ۲۸۰ھ۔ ثقہ صدوق، فہیم، حافظ، محتاط، مذہب السنۃ میں شہرت یافتہ ہیں۔ تمام علماء نے وثاقت کی تصدیق کی ہے۔

۲۔ عمرو بن عون بن اوس واسطی البزاز المتوفی ۲۲۵ھ۔ صحاح ستہ کے راوی ہیں۔ عجلی، مسلمہ، ابو حاتم نے توثیق کی ہے۔ ابو حاتم نے ثقہ حجت قرار دیا ہے۔

۳۔ خالد بن عبد اللہ الواسطی المتوفی ۱۷۹ھ۔ صحاح ستہ کے راوی ہیں۔ حافظ، ثقہ صحیح الحدیث تھے۔ ابن سعد، ابو زرعہ، نسائی، ابو حاتم، ترمذی وغیرہ نے توثیق کی ہے۔

مصادر حالات رواۃ:

تاریخ البخاری الکبیر ۱ ق ۱/ ۴۴، ۲ ق ۱/ ۱۴۷، ۳ ق ۲/ ۲۸۰، ۳ ق ۲/ ۳۶۱، ۴ ق ۱/ ۴۱، ۳۳۷، ۴ ق ۲/ ۳۳۴۔ طبقات ابن سعد ۶/ ۵۷، ۱۸۸، ۲۲۷، ۲۹۰، ۲۸۲، ۷ ق ۲/ ۶۱-۶۲۔ الجرح والتعدیل ۱ ق ۱/ ۱۴۵، ۱ ق ۲/ ۳۴۰، ۳ ق ۱/ ۱۹۰، ۲۵۲، ۳۰۴، ۳/ ۱۹۰، ۴ ق ۱/ ۳۸۵، ۴ ق ۲/ ۲۶۵۔ تہذیب التہذیب ۱/ ۱۷۷، ۳/ ۱۰۰، ۷/ ۲۷۶-۲۷۸، ۳۳۲، ۸/ ۸۶، ۹/ ۶۲، ۱۰/ ۲۱۸، ۱۱/ ۳۲۹-۳۳۱ وغیرہ۔

بیتُ الشّرف رسالتُ میں ماتم

حافظ محب الدین طبری نے ذخائر العقبیٰ ص ۱۴۸ پر نقل کیا ہے کہ احمد و ابن الضحاک نے حضرت علیؑ سے روایت کی ہے کہ میں حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ میں نے عرض کی یا نبی اللہ، کیا کسی نے آپ کو رنجیدہ کیا ہے، آخر یہ آنکھوں سے آنسو کیوں جاری ہیں؟ فرمایا، ابھی میرے پاس سے جبرئیلؑ گئے ہیں اور وہ یہ کہہ گئے ہیں کہ میرا حسینؑ فرات کے کنارے شہید ہوگا۔ بلکہ یہ بھی پوچھا تھا کہ آپ چاہیں تو خاکِ مقتل بھی دے دوں اسے سونگھ لیجئے —— اور جب میں نے خواہش ظاہر کی تو ہاتھ بڑھا کر یہ ایک مشتِ خاک اُٹھا کر مجھے دی ہے جس کے بعد میں اپنے قابو سے باہر ہوگیا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔

امینی (طاب ثراہ) —— آیندہ ماتم میں اس ماتم کی سند پر بحث ہوگی اس لئے یہاں تذکرہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

کربلا میں

امیر المومنینؑ کی طرف سے صفِ عزا

امام احمد بن حنبل نے مسند ۲/ ۶۰-۶۱ طبع دوم میں تحریر فرمایا ہے کہ مجھ سے محمد بن عبید نے، ان سے شرجیل بن مدرک نے، ان سے عبد اللہ بن نجیؒ نے، ان سے ان کے والد نے بیان کیا ہے کہ میں حضرت علیؑ کا ہمسفر تھا جب آپ صفین میں جاتے ہوئے سرزمینِ نینوا پر پہنچے تو آپ نے بہ آوازِ بلند کہا: " ابو عبد اللہ صبر کرنا، ابو عبد اللہ صبر کرنا، ابو عبد اللہ صبر کرنا شطِّ فرات پر"۔ میں نے عرض کی یا حضرت، یہ کیا ہے؟ آپؑ نے فرمایا کہ میں ایک دن رسولِ اکرمؐ کی خدمت میں پہنچا تو آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ میں نے عرض کی یا رسولؐ اللہ! کیا کسی نے آپ کو رنجیدہ کیا ہے؟ آخر آنکھوں سے آنسو کیوں جاری ہیں؟ تو آپ نے فرمایا کہ ابھی میرے پاس سے جبرئیلؑ گئے ہیں۔ انھوں نے بیان کیا ہے کہ میرا حسینؑ شطِّ فرات پر شہید ہوگا۔ بلکہ انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر کہیئے تو میں وہ خاک بھی دکھلادوں اور پھر میری خواہش پر ایک مُشتِ خاک مجھے عطا کی ہے جس کے بعد بے ساختہ میرے آنسو نکل آئے۔

★ ابن ابی شیبہ نے "المصنّف" جلد دوازدہم میں محمد بن عبید سے انھی الفاظ و اسناد کے ساتھ نقل کیا ہے لیکن اس میں "صبرًا اباعبد اللہ، صبرًا اباعبد اللہ" ہے۔

★ ابن سعد نے علی بن محمد سے، انھوں نے یحییٰ بن زکریا سے، انھوں نے ایک شخص سے، اور اس نے عامر شعبی سے روایت کی ہے کہ جب حضرت علیؑ کا گذر راہِ صفین

میں کربلا سے ہوا تو آپ نے ٹھہر کر وہاں کے آدمی سے پوچھا، اس زمین کا کیا نام ہے؟ اس نے کہا کربلا۔ آپ بے ساختہ رونے لگے یہاں تک کہ آنسوؤں سے زمین تر ہو گئی۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ ایک دن میں رسولؐ اکرم کی خدمت میں حاضر ہوا تھا تو حضرتؐ بھی رو رہے تھے۔ میں نے سبب پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ ابھی ابھی جبرئیلؑ خبر دے گئے ہیں کہ میرا فرزند حسینؑ شطِ فرات پر قتل ہو گا۔ اس جگہ کا نام کربلا ہو گا۔ اس کے علاوہ جبرئیلؑ نے ایک مشتِ خاک بھی مجھے سنگھائی ہے جس کے بعد بے ساختہ میرے آنسو نکل پڑے۔

سند صحیح اور رجال ثقات ہیں:

۱۔ محمد بن عبید بن ابی اُمیّہ طنافسی ابو عبداللہ الکوفی الاحدب المتوفی ۲۰۳ھ۔ صحاح ستّہ کے رجال میں ہیں۔ ایک جماعت نے توثیق کی ہے۔ یہ عثمانی تھے اور کہا کرتے تھے کہ خیر اُمّت ابو بکر، پھر عمر، پھر عثمان ہیں۔ خبردار کوفہ والوں کے کہنے میں نہ آنا۔

۲۔ شرجیل بن مدرک الجعفی الکوفی، ابن معین نے توثیق کی ہے۔ ابن حبان نے ثقات میں ذکر کیا ہے اور دوسرے لوگوں نے اس کی تائید کی ہے۔

۳۔ عبداللہ بن نجیّ بن سلمہ الکوفی الحضرمی۔ نسائی نے توثیق کی ہے اور ابن حبان نے ثقات میں ذکر کیا ہے۔

۴۔ نجیّ الحضرمی الکوفی۔ حضرت علیؑ کے آفتابہ بردار تھے۔ آپ کے دس بیٹے تھے جن میں سے سات حضرت علیؑ کے ساتھ شہید ہوئے تھے۔ بقول عجلی آپ تابعی ثقہ تھے۔

★ حافظ ابو یعلیٰ نے اپنی مسند میں ابو خیثمہ کے واسطے سے محمد بن عبید سے روایت کی ہے۔ سند اور الفاظ ابن حنبل ہی کے ہیں۔ (ابو خیثمہ ترمذی کے علاوہ صحاح ستّہ کے راوی ہیں۔)

★ حافظ طبرانی نے معجم کبیر جزءِ اوّل میں اسی سند مذکور کے ساتھ ان الفاظ میں روایت کی ہے کہ جب حضرت نینوا کے قریب پہنچے تو آپ نے فرمایا "ابا عبد اللہ صبر، ابا عبد اللہ صبر، فرات کے کنارے"۔ میں نے عرض کی یا امیر المومنینؑ یہ کیا ہے؟ فرمایا، میں ایک دن رسولِ خدا کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ میں نے سبب پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ ابھی جبرئیلؑ مجھے یہ خبر دے گئے ہیں کہ میری اُمّت میرے فرزند کو شہید کرے گی اور پھر میری خواہش پر ایک مُشت خاکِ کربلا دکھائی جس کے بعد بے ساختہ میرے آنسو نکل آئے۔

★ حافظ ابن عساکر نے تاریخ الشام میں نقل کیا ہے کہ مجھ سے ابو غالب ابن البناء نے، ان سے ابو الغنائم ابن المامون نے، ان سے ابو القاسم بن حبانہ نے، ان سے ابو القاسم بغوی نے، ان سے یوسف بن موسیٰ قطان نے، ان سے محمد بن عبید نے اپنے اسناد کے ساتھ طبرانی کے الفاظ میں روایت بیان کی ہے۔

★ ابن عساکر ہی رقم طراز ہیں کہ مجھے ابو المظفر قشیری نے، انھیں ابو سعید جنزرودی نے، انھیں ابو عمرو بن حمدان نے خبر دی ہے ـــ ح ـــ مجھے ابو سہل محمد بن ابراہیم نے، انھیں ابراہیم بن منصور نے، انھیں ابو بکر بن المقریٰ نے ـــ اور ابن حمدان و ابن المقریٰ دونوں کو ابو یعلیٰ نے اور انھیں ابو خیثمہ نے مذکورہ الفاظ و اسناد کے ساتھ خبر دی ہے۔

★ مجھے ابو علی الحسن بن المظفر نے، انھیں ابو محمد الجوہری نے ـــ انھیں ابو القاسم بن الحسین نے، انھیں ابو علی التمیمی نے ـــ اور ان دونوں کو احمد بن جعفر نے، انھیں عبد اللہ بن احمد بن حنبل نے خبر دی ہے کہ مجھے میرے والد نے اپنے اسناد اور مذکورہ الفاظ کے ساتھ روایت کی خبر دی ہے۔

★ مجھے ابو بکر محمد بن عبد الباقی، انھیں الحسن بن علی نے، انھیں محمد بن العباس نے، انھیں احمد بن معروف نے، انھیں الحسین بن فہم نے، انھیں محمد بن سعد نے مذکورہ اسناد و الفاظ کے ساتھ خبر دی ہے۔

★ فقیہ ابن مغازلی نے مناقب میں ابو عبد اللہ محمد بن الحسین الزعفرانی الواسطی

ابن نجی نے نجی کے طریق سے بھی روایت کی ہے لیکن اس میں "صبرًا اباعبداللہ" کے بعد یہ فقرہ بھی ہے کہ راوی نے یہ سوال کیا کہ ابو عبداللہ سے مراد کون ہے؟

★ حافظ ضیاء الدین المقدسی نے المختارہ میں نقل کیا ہے کہ مجھے المبارک بن ابی المعالی نے بعنوان قرأت خبر دی ہے۔ میں نے ان کو یہ سنایا تھا کہ آپ کو ہبۃ اللہ بن محمد نے قرأۃً خبر دی ہے۔ ان سے الحسن بن علی بن المذہب نے، ان سے احمد بن جعفر بن حمدان نے، ان سے عبداللہ بن احمد نے، ان سے ان کے والد نے مذکورہ الفاظ و اسناد کے ساتھ روایت کی ہے۔

بقیہ مصادرِ حدیث :

★ مقتل الحسین خوارزمی ۱/۱۷۰ میں عبداللہ بن المبارک سے نقل ہوا ہے کہ جب جبرئیلؑ کسی فرزندِ رسولؐ کے مقتل و مشہد کی مٹی لاتے تھے تو حضرت اسے سونگھ کر بتا دیا کرتے تھے کہ یہ میرے حسینؑ کی خوشبو ہے اور یہ کہہ کر رونے لگتے تھے اور جبرئیلؑ اس کی تصدیق کرتے تھے۔

★ ابو علی السلامی البیہقی نے تاریخ میں نقل کیا ہے کہ پیغمبرِ اسلامؐ نے حسینؑ بن علیؑ سے بیان فرمایا ہے کہ جنت میں تمہارا ایک ایسا درجہ ہے جو بغیر شہادت کے نہیں مل سکتا ہے ـــــ اور یہی وجہ ہے کہ جب امام حسینؑ نرغۂ اعدا میں گھر گئے تو آپ کو یقین تھا کہ میں شہید ہو جاؤں گا اسی لئے آپ نے صبر کیا اور مضطرب نہیں ہوئے یہاں تک کہ شہید ہو گئے۔ علیہ افضل السلام۔

★ تذکرۃ السبط ابی المظفر ابن الجوزی ص ۱۴۲ پر ابن سعد سے شعبی کے طریق سے روایت نقل ہوئی ہے۔

★ ذخائر العقبیٰ محب طبری ص ۱۱۸ پر احمد اور ابن ضحاک سے روایت نقل ہوئی ہے۔

★ تاریخ الشام ابن کثیر ۸/۱۹۹ پر احمد سے اس سند کے ساتھ روایت نقل

ہوئی ہے کہ محمد بن سعد نے علی بن محمد سے، انھوں نے یحییٰ بن زکریا سے، انھوں نے ایک شخص سے، اس نے عامر شعبی سے، انھوں نے علیؑ سے روایت کی ہے۔

★ مجمع الجوامع حافظ سیوطی ۹/ ۲۲۳ پر احمد و مسند ابو یعلیٰ و ابن سعد و طبرانی سے روایت خصائص کبریٰ سیوطی ۲/ ۱۲۶ پر ابو منعم کے حوالہ سے نقل ہوئی ہے۔

حافظ سیوطی۔

★ الجامع الصغیر سیوطی ۱/ ۱۳ پر ابن سعد سے روایت نقل ہوئی ہے۔

★ مجمع الزوائد حافظ ہیثمی ۹/ ۱۸۷ پر احمد، ابو یعلیٰ، بزاز، طبرانی سے اس تبصرہ کے ساتھ روایت نقل ہوئی ہے کہ اس کے رجال ثقہ ہیں۔

★ صواعق ابن حجر ہیثمی ص ۱۱۵ بحوالہ ابن سعد و احمد و شرح ہمزیہ بوصیری ص ۲۷۶۔

★ الصراط السوی للشیخانی المدنی ص ۹۳ بروایت احمد ابن سعد و احمد مختصراً۔

★ جوہرۃ الکلام للسید محمود القراغوالی الحنفی ص ۱۱۸ بحوالۂ ابن سعد۔

★ السراج المنیر شرح الجامع الصغیر للعزیزی ۱/ ۶۸ پر یہ اضافہ بھی درج ہے کہ علقمی کے بیان کے مطابق ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ ارضِ طف پر جو ساحلِ بحر ہے حسینؑ شہید ہوں گے۔ ارض طف میں ان کی خواب گاہ ہے۔ بروایت ابن سعد وطبرانی —— لہٰذا اب کربلا کے علاوہ جتنے اقوال ہیں وہ سب باطل ہیں، ہاں یہ ضرور ہے کہ حضرتؑ کے سرِ مبارک کو شہروں میں گردش دی گئی ہے۔ خدا آلِ بیتِ نبوت کی توہین کرنے والوں اور ان کے ساتھ ناروا سلوک کرنے والوں پر لعنت کرے۔

★ حاشیہ الجامع الصغیر للحفنی "ہامش السراج" ۱/ ۶۸ پر روایت کے بعد عزیزی کے حوالے سے علقمی کا تبصرہ بھی نقل کیا ہے۔

★ فیض القدیر شرح الجامع الصغیر للمناوی ۱/ ۲۰۴ پر اس خبر کو علائمِ نبوّت اور معجزاتِ رسالت میں شمار کیا گیا ہے۔

★ شرح المسند الاحمد تالیف احمد محمد شاکر ۲/ ۶۰ پر یہ تبصرہ بھی درج ہے کہ

روایت کی سند صحیح ہے۔

○

ماتمِ کربلا کی دوسری شکل

نصر بن مزاحم کتاب صفین ص ۱۵۸ طبع مصر پر سعید بن حکیم عیسیٰ سے، وہ الحسن بن کثیر سے، وہ کثیر سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت علیؑ جب کربلا پہنچے تو آپ ٹھہر گئے۔ لوگوں نے عرض کی حضور یہ کربلا ہے۔ فرمایا، ہاں صاحبِ کرب و بلا ـــــ اس کے بعد انگشت مبارک سے ایک جگہ کی طرف اشارہ فرمایا۔ "یہاں ان کی سواریاں اُتریں گی۔ یہاں ان کا قیام ہو گا" ـــــ پھر ایک طرف اشارہ فرمایا۔ "یہاں ان کے خون بہائے جائیں گے"۔ (ابن ابی الحدید نے شرح النہج ۱/۲۷۸ پر اس روایت کو نقل کیا ہے۔)

* حافظ ابو نعیم نے دلائل النبوۃ ۲۱۱/۳ پر اپنے اسناد سے اصبغ بن نباتہ سے نقل کیا ہے کہ جب ہم حضرت علیؑ کے ساتھ قبرِ حسینؑ کی جگہ تک پہنچے تو آپ نے فرمایا، "یہاں ان کے ناقے بیٹھیں گے، یہاں سواریاں اُتریں گی۔ آلِ محمدؐ کے جوان جو اسی سرزمین پر شہید ہوں گے، ان پر زمین و آسمان گریہ کریں گے"۔ اس روایت کو سیوطی نے خصائص کبریٰ ۱۲۶/۲ میں، ابن کثیر نے الوسیلہ میں، قراغولی نے جوہرۃ الکلام ص ۱۱۱ میں، ابن حجر نے صواعق ص ۱۱۵ میں، سید شیخانی نے الصراط السوی ص ۹۴ میں، ملا متقی نے سیرت میں، ابن اخضر نے معالم العترۃ میں نقل کیا ہے۔

* الحسن بن کثیر و عبد خیر راوی ہیں کہ جب حضرت علیؑ کربلا تک پہنچے تو آپ نے وہاں ٹھہر کر گریہ فرمایا۔ "میرے ماں باپ قربان ان جوانوں پر جو اس سرزمین پر قتل ہوں گے۔ یہاں ان کے اونٹ بٹھائے جائیں گے۔ یہاں سواریاں اُتریں گی۔ یہاں اس نیک انسان کی قربانی ہو گی" ـــــ یہ کہہ کر اور زور سے روئے۔ اس روایت کو ابو المظفر السبط نے تذکرہ ص ۱۴۲ پر نقل کیا ہے۔

* حافظ ابن کثیر نے اپنی تاریخ البدایۃ والنہایۃ ۱۹۹/۸ پر تحریر فرمایا ہے کہ

محمد بن سعد وغیرہ نے حضرت علی سے روایت کی ہے کہ جب آپ صفین جاتے ہوئے کربلا میں حنظل کے درختوں کے پاس سے گذرے تو آپ نے اس زمین کا نام پوچھا۔ لوگوں نے کربلا بتایا تو آپ نے فرمایا "کرب و بلا"۔ اس کے بعد اس درخت کے نزدیک نماز پڑھی اور فرمایا، یہاں کچھ لوگ شہید ہوں گے جو بہترین شہدا ہوں گے، غیر صحابہ میں اور جنّت میں بلا حساب داخل ہوں گے۔ یہ کہہ کر آپ نے ایک جگہ کی طرف اشارہ کیا اور لوگوں نے وہاں نشان بنا دیا۔ بعد میں اسی جگہ امام حسینؑ کی شہادت واقع ہوئی۔

(امینی طاب ثراہ۔ یہ امیر المومنینؑ کے منتشر کلمات ہیں جو مختلف وجوہ اور متعدد طریقوں سے نقل ہوئے۔ ان میں بعض طریق صحیح ہیں، بعض حسن ہیں اور بعض میں ضعف ہے۔ لیکن وہ ضعف بھی دیگر روایات کی تائید سے ختم ہوگیا ہے۔)

(ابن کثیر پر شامی ذہنیت غالب تھی۔ انھوں نے بعض مقامات پر یزید جیسے افراد کی حمایت کی ہے۔ اس لئے خیر الشہداء کے ساتھ غیر صحابہ کا اضافہ ان کے مزاج کے لئے انتہائی ضروری تھا ورنہ ایسی کوئی بات کسی روایت میں نہیں ہے اور بلا شبہ امام حسینؑ اس پوری کائنات کے شہداء سے افضل و برتر ہیں۔)

○

ماتمِ کربلا کی ایک اور سند

حافظ خوارزمی نے مقتل الحسین ص ۱۶۲ پر ایک حدیث طبرانی کے حوالہ سے شیبان عثمانی سے نقل کی ہے کہ میں کربلا میں حضرت علیؑ کے ساتھ تھا، وہاں آپ نے فرمایا تھا کہ یہاں کچھ شہدا شہید ہوں گے جن کا کوئی مثل نہ ہوگا سوائے شہدائے بدر کے۔

★ شیخ الاسلام جشمی رقم طراز ہیں کہ امیر المومنین علیؑ صفین جاتے ہوئے

کربلا میں اُترے اور ابن عباسؓ سے فرمایا کہ اس بقعہ کو جانتے ہو؟ عرض کی نہیں! فرمایا، اگر جانتے ہوتے تو میری طرح گریہ کرتے۔ اور یہ کہہ کر حضرت شدت کے ساتھ روئے۔ پھر فرمایا، میں نے آلِ سفیان کا کیا بگاڑا ہے —— پھر حسینؑ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا صَبْرًا یَا بُنَیَّ بیٹا صبر کرنا۔ تیرے باپ نے بھی ان سے ایسے ہی مصائب کا سامنا کیا ہے جیسے مصائب تیرے سامنے آئیں گے"

اس روایت کو طبرانی نے معجم کبیرہ جزء اوّل میں نقل کیا ہے اور اس کے رواۃ سب ثقہ ہیں۔ حافظ ہیثمی نے بھی روایت کی تصحیح کی ہے۔

ماتم یوم عاشورا

امام احمد بن حنبل مسند ۱/۲۸۳ پر رقم طراز ہیں کہ مجھ سے عفان نے، ان سے ابن سلمہ حماد نے، ان سے عمار نے ــــــ ان سے ابن عباس نے بیان کیا ہے کہ میں نے دوپہر کے وقت پیغمبرؐ اسلام کو خواب میں دیکھا، آپ کے بال پریشان اور گرد آلود تھے۔ آپ کے ہاتھ میں ایک شیشہ تھا جس میں خون تھا۔ میں نے عرض کیا میرے ماں باپ قربان، یہ کیا عالم ہے؟ فرمایا، یہ حسینؑ اور ان کے اصحاب کا خون ہے، جو میں صبح سے جمع کر رہا ہوں۔ میں نے اس دن کو محفوظ کر لیا اور بعد میں معلوم ہوا کہ وہی روزِ شہادتِ حسینؑ تھا۔

مسند ہی میں عبدالرحمٰن، حماد بن سلمہ کے اسناد سے یہ روایت قدرے تغیّر کے ساتھ نقل ہوئی ہے۔

اسناد احمد بن حنبل:

عفان بن مسلم ابو عثمان البصری المتوفیٰ ۲۲۰ھ صحاح ستہ کے رجال میں ہیں۔ ان کی وثاقت متفق علیہ ہے۔

۲۔ حماد بن سلمہ البصری ابو سلمہ المتوفیٰ ۱۶۷ھ صحاح ستہ کے راوی، امام المسلمین، متفق علیہ ثقہ تھے۔

۳۔ عمار بن ابی عمار المکی المتوفیٰ فی ولایۃ خالد بن عبداللہ القسری علی العراق بخاری کے علاوہ صحاح ستہ کے راوی ہیں۔ احمد، ابو داؤد، ابو حاتم، ابو زرعہ وغیرہ نے توثیق کی ہے۔

★ حافظ طبرانی نے المعجم الکبیر جزء اول میں اس روایت کو اس سند کے ساتھ نقل کیا ہے کہ علی بن عبدالعزیز۔ ابومسلم کشی ـــــ ان دونوں سے حجاج بن المنہال اور ابومسلم کشی سے سلیمان بن حرب اور دونوں سے حماد بن سلمہ نے اسناد مذکور و الفاظ مذکور کے ساتھ بیان کیا ہے۔

رجال اسناد:

علی بن عبدالعزیز ابوالحسن بغوی متوفی ۲۸۶ھ فقیہ حرم۔ ثقہ محتاط، متفق علیہ شخصیت تھے۔

۲۔ ابومسلم ابراہیم بن عبداللہ الکشی الکجی البصری المتوفی ۲۹۲ھ حافظ، صاحب سنن، مسند الرقت ثقہ تھے۔ اکثر صاحبانِ رجال نے تعریف کی ہے۔

۳۔ حجاج بن المنہال ابو محمد السلمی الانماطی المتوفی ۲۱۷ھ صحاح ستہ کے راوی ہیں۔ احمد، ابوحاتم، عجلی، نسائی، ابن قانع وغیرہ نے توثیق کی ہے۔

۴۔ سلیمان بن حرب الازدی ابوتراب البصری المتوفی ۲۲۴ھ صحاح ستہ کے رجال میں ہیں۔ نسائی، ابن خراش، ابن سعد، ابن قانع وغیرہ نے توثیق کی ہے ـــــ ابوحاتم کا بیان ہے کہ سلیمان بہت کم کسی شیخ سے روایت کرتے تھے، لہٰذا اگر سلیمان روایت کردیں تو سمجھو کہ وہ شخص معتبر ہے۔

★ طبرانی ہی نے المعجم الکبیر جزء ثالث میں اس سند سے روایت نقل کی ہے کہ مجھ سے علی بن عبدالعزیز و ابومسلم نے، ان دونوں سے حجاج بن المنہال نے ـــــ ح ـــــ ان سے یوسف قاضی نے، ان سے سلیمان بن حرب نے، اور دونوں سے حماد بن سلمہ نے باسناد و الفاظ مذکور بیان کیا ہے۔

★ حافظ بیہقی نے دلائل النبوۃ میں نقل کیا ہے کہ مجھ سے ابوالحسن علی بن محمد المقری نے، ان سے الحسن بن محمد بن اسحاق نے۔ ان سے یوسف بن یعقوب نے اور ان سے سلیمان بن حرب نے باسناد و الفاظ مذکور روایت کی ہے۔

★ بیہقی ہی نے "باب رؤیا النبیؐ" میں لکھا ہے کہ مجھ سے ابوالحسن بن علی بن احمد بن عبدان نے۔ ان سے احمد بن عبید الصفار نے، ان سے بشر بن موسیٰ اسدی نے، ان سے الحسن بن موسیٰ الاشیب نے اور ان سے حماد نے باسناد و الفاظ مذکور روایت کی ہے۔

★ حاکم نے مستدرک ۴/ ۳۹۷ پر ابو بکر محمد بن احمد بن بابویہ۔ بشر بن موسیٰ اسدی، حسن بن موسیٰ اشیب، حماد بن سلمہ سے باسناد و الفاظ مذکور روایت کرتے ہوئے یہ نوٹ لکھا ہے کہ یہ روایت بخاری و مسلم کے شرائط پر صحیح ہے لیکن انھوں نے اپنی کتاب میں جگہ نہیں دی ہے۔

★ حافظ ابو عمر نے "استیعاب" ۱/ ۱۴۴ پر طریق حافظ ابو بکر بن ابی شیبہ عن عفان بن مسلم سے اسناد و الفاظ مذکور میں روایت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ شعر دورِ قدیم سے مشہور ہے لیکن اس کا قائل نہیں معلوم ہے۔ "کیا وہ اُمّت جس نے حسینؑ کو شہید کیا ہے وہ بھی ان کے جد کی شفاعت کی امیدوار ہے۔ لوگ حسینؑ پر روئے اور بہت روئے ہیں۔"

★ حافظ ابن عساکر نے "تاریخ الشام" ۴/ ۳۴۰ پر اُمّ الکتاب سے نقل کیا ہے جو قلمی نسخہ میرے پاس موجود ہے۔

★ حافظ عراقی نے "طرح التثریب" ۱/ ۴۲ پر احمد کے حوالے سے روایت نقل کی ہے اور عمار کا یہ قول محفوظ کر لیا ہے کہ ہم لوگوں نے اس دن کو یاد رکھا اور وہ دن قتلِ حسینؑ کا نکلا۔

★ ابو القاسم طلحی اصفہانی نے "سیر السلف" میں نقل کیا ہے جسے میں نے علی گڑھ یونیورسٹی کے کتب خانے میں دیکھا ہے۔

★ ابو السعادات بن اثیر نے "اسد الغابہ" میں ۲/ ۲۲ پر اور کتاب المختار من مناقب الاخیار میں نقل کیا ہے۔

★ جمال الدین زرندی نے "نظم الدرر" ص ۲۱۷ پر طریق احمد سے روایت

کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ابن عباس قیلولہ کر رہے تھے۔ خواب سے اٹھے تو زبان پر "اِنّا للہ" کا فقرہ تھا۔ تمام لوگ پریشان ہو گئے۔ پوچھا یہ کیا قصہ ہے؟ تو انھوں نے کہا کہ میں نے رسول اکرمؐ کو خواب میں دیکھا ہے کہ آپ زمین سے کچھ اُٹھا رہے تھے۔ میں نے دریافت کیا یہ کیا ہے؟ تو فرمایا کہ حسینؑ کے خون کو آسمان کی طرف لے جا رہا ہوں۔

★ حافظ گنجی نے "کفایہ" ص ۲۱۰ پر جوہری کے حوالے سے روایت کی ہے۔

★ حافظ محب طبری نے "ذخائر العقبیٰ" ص ۱۴۸ پر ابن بنت منیع اور ابو عمر و حافظ سلفی کے حوالے سے روایت نقل کی ہے۔

★ ابو الفضائل عمار زنجانی نے "نزہۃ الابرار" میں روایت نقل کی ہے جسے میں نے ہندوستان میں دیکھا ہے۔

★ ابو المظفر سبط جوزی نے "طرح التثریب" ۱/۴۲ پر مسند احمد کے حوالے سے نقل کیا ہے۔

★ حافظ ہیثمی نے "مجمع الزوائد" ۹/۱۹۴ پر احمد و طبرانی کے حوالے سے یہ کہہ کر نقل کیا ہے کہ رجال احمد صحیح کے رجال ہیں۔

★ حافظ ابن حجر نے "صواعق" ص ۱۱۶ پر احمد کے الفاظ میں نقل کیا ہے۔

★ خطیب عمری نے "مشکوٰۃ المصابیح" ۲/۱۷۲ پر احمدی کے الفاظ میں نقل کیا ہے۔

★ حافظ سیوطی نے "خصائص الکبریٰ" ۲/۱۲۶ پر اور "تاریخ الخلفاء" ص ۱۳۹ پر احمد بیہقی کی دلائل سے نقل کیا ہے۔

★ سید شیخانی نے "الصراط السوی" میں احمد و عبد بن حمید دونوں کے الفاظ میں نقل کیا ہے۔

★ شعرانی نے "مختصر تذکرۂ قرطبی" ص ۱۲۰ پر امام قرطبی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اس کی سند صحیح اور ناقابلِ طعن ہے ــــــ ابن عباس بیان یہ بھی ہے کہ

قوم نے شہادت حسینؑ کے بعد حرم رسولؐ اللہ کو اسیروں کی طرح کھینچا یہاں تک کہ کوفہ پہنچے تو لوگ تماشہ کے لئے نکل آئے۔ انھیں اسیروں میں علیؑ بن الحسینؑ بھی تھے جو انتہائی مریض تھے لیکن ان کے دونوں ہاتھوں کو پسِ گردن سے باندھ دیا گیا تھا۔ جناب زینبؑ بنتِ علیؑ و فاطمہ زہراؑ، جناب ام کلثومؑ، فاطمہؑ و سکینہؑ بنت الحسینؑ بھی تھیں۔ فاسقوں نے اسیروں کے ساتھ شہداء کے سر بھی رکھے جن کے بارے میں محمد بن الحنفیہ کا قول تھا کہ حسینؑ بن علیؑ کے ساتھ اولادِ فاطمہؑ میں سے ۱۷ سولہ افراد شہید ہوئے۔ اور حسن بصری کہا کرتے تھے کہ حسینؑ بن علیؑ کے ساتھ ۱۶ سولہ افراد ان کے خاندان کے ایسے تھے جن کی مثال روئے زمین پر نہ تھی ــــــ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ امام حسینؑ کے ساتھ ان کے اولاد و اخوان و اہلبیتؑ میں سے ۲۳ افراد درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

* قرمانی نے اپنی تاریخ کے ص ۱۰۹ پر نقل کیا ہے اور استاذ احمد محمد شاکر نے مسند احمد کے حاشیہ ۴/۲۶۔۱۹۰ پر اس کی صحت کا اعلان کیا ہے۔

ماتمِ عاشوراء کی دیگر اسناد

حافظ ترمذی نے جامع صحیح ۱۲/۱۹۳ پر تحریر فرمایا ہے کہ مجھ سے ابو سعید الشیخ نے، ان سے ابو خالد احمر نے اور ان سے رزین نے سلمہ کا قول نقل کیا ہے کہ ام سلمہ کی خدمت میں حاضر ہوئی تو وہ گریہ فرما رہی تھیں۔ میں نے وجہ پوچھی تو فرمایا کہ میں نے رسولِ اکرمؐ کو خواب میں دیکھا ہے۔ آپ کی ریشِ مبارک اور سر پر خاک پڑی ہوئی تھی۔ میں نے سبب دریافت کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ میں ابھی شہادتِ حسینؑ کو دیکھ کر آیا ہوں۔

اسنادِ جیّد:

ابو سعید الاشج عبد اللہ بن سعید الکندی الکوفی المتوفی ۲۵۷ھ۔ صحاح ستّہ کے

رجال میں ہیں۔ ابوحاتم نے ثقہ صدوق اور امام زمانہ قرار دیا ہے۔ خلیلی اور مسلمہ بن قاسم نے توثیق کی ہے۔ ابن حبان نے ثقات میں ذکر کیا ہے اور نسائی نے صداقت کی تعریف کی ہے۔

۲۔ ابوخالد احمر سلیمان بن حیان ازدی کوفی متوفی ۱۸۹ھ صحاح ستہ کے رجال میں ہیں۔ ابن معین، ابن سعد، ابن المدینی وغیرہ نے توثیق کی ہے۔ رفاعی نے ثقہ، امین کہا ہے۔ عجلی نے ثقہ ثبت صاحب سنت سے تعبیر کیا ہے اور ابوحاتم نے صدوق کہا ہے۔

۳۔ رزین ابن حبیب الجہنی البکری الکوفی۔ ترمذی کے رجال میں ہیں۔ احمد و ابن معین نے توثیق کی ہے۔ ابن حبان نے ثقات میں ذکر کیا ہے۔ ابوحاتم نے صالح الحدیث قرار دیا ہے۔

۴۔ سلمیٰ البکریہ کنیز بکر بن وائل۔ حضرت ام سلمہ و عائشہ سے روایت کرتی ہیں۔ صحیح الحدیث ہیں۔ ان کی حدیث کا شمار صحاح میں ہوتا ہے۔

* حاکم نے مستدرک ۴/۱۹ پر نقل کیا ہے کہ مجھے ابوالقاسم الحسن بن محمد بن الحسن السکونی نے کوفہ میں، انھیں محمد بن عبداللہ حضرمی نے، انھیں ابوکریب نے، انھیں ابوخالد الاحمر نے، انھیں رزین نے اور انھیں سلمیٰ نے اس روایت کی خبر دی ہے۔

شیوخ حاکم:

۱۔ ابوالقاسم الحسن بن محمد بن الحسن السکونی الکوفی۔ حافظ دارقطنی کے مشائخ میں ہیں اور حاکم وغیرہ کے بھی شیوخ میں ہیں۔

۲۔ محمد بن عبداللہ الحضرمی الکوفی المعروف بمطین المتوفی ۲۹۷ھ حافظ ثقہ ہیں۔ ان کا تذکرہ کئی مرتبہ ہو چکا ہے۔

۳۔ ابوکریب محمد بن العلاء الہمدانی الکوفی المتوفی ۲۴۸ھ حافظ ثقہ اور صحاح ستہ

کے راوی ہیں۔

★ حافظ بیہقی نے دلائل النبوۃ میں "باب رؤیۃ النبیؐ فی المنام" میں نقل کیا ہے کہ مجھ سے عبد الحافظ نے، ان سے احمد بن علی المقریٰ نے، ان سے ابو عیسیٰ ترمذی نے، ان سے ابو سعید الاشج نے، ان سے ابو خالد الاحمر نے، ان سے رزین نے سلمیٰ کے واسطے سے یہ حدیث بیان کی ہے۔

شیوخ بیہقی:

۱۔ ابو عبد الحافظ حاکم المستدرک نیشاپوری متوفیٰ ۴۰۵ھ۔ جن کی سب نے توثیق کی ہے اور اہل رجال نے مدح وثنا کی ہے۔

۲۔ احمد بن علی المقریٰ نیشاپوری المتوفیٰ ۳۵۰ھ۔ ابو موسیٰ ترمذی اور ابو حاتم رازی سے سماع کیا ہے۔ انتہائی عبادت گذار اور بقول حاکم صحیح السماع تھے۔

★ حافظ ابن عساکر نے تاریخ الشام میں حالات امام حسینؑ میں نقل کیا ہے کہ مجھے ابو الفتح محمد بن علی بن عبد اللہ المصری اور ابو بکر ناصر بن ابی العباس بن علی صیدلانی نے مجموعاً خبر دی ہے کہ ہم سے ابو عبد اللہ محمد بن عبد العزیز محمد الفارسی نے، ان سے ابو محمد بن ابی شریح نے، ان سے یحییٰ بن ساعد نے، ان سے ابو سعید الاشج نے ان سے ابو خالد الاحمر نے، ان سے رزین نے سلمیٰ کے حوالے سے اس حدیث کو بیان کیا ہے۔

(تہذیب التاریخ ۴/ ۳۴۰ پر بھی یہ روایت مذکور ہے لیکن اس میں سند کا ذکر نہیں ہے۔)

شیوخ ابن عساکر:

۱۔ ابو الفتح محمد بن علی بن عبد اللہ بن ابی الحسن المصری الواعظ الہروی حافظ ابن عساکر کے شیوخ میں تھے اور انھوں نے ان سے ہرات میں پڑھا ہے۔

۲۔ ناصر بن ابی عباس بن علی ابو بکر صیدلانی۔ ان سے بھی ابن عساکر نے

جامع ہرات میں استفادہ کیا ہے۔ جیسا کہ مشیخہ میں ذکر ہے۔

۳۔ محمد بن عبدالعزیز بن محمد ابو عبداللہ الفارسی الفقیہ المتوفی ۲۷۰ھ۔ تغری بروی کا بیان ہے کہ یہ امام فقیہ نحوی محدث تھے۔

۴۔ عبدالرحمٰن بن ابی شریح ابو محمد الانصاری المتوفی ۳۹۲ھ۔ عالی الاسناد اور مرجع طلاب علم تھے۔

۵۔ یحییٰ بن محمد بن ساعد ابو محمد مولیٰ ابی جعفر المنصور البغدادی المتوفی ۳۱۸ھ بقول دارقطنی ثقہ محتاط حافظ تھے۔ بقول ذہبی حافظ امام ثقہ تھے۔ بقول ابن الجوزی ثقہ مامون حافظ کبیر اور مرجع اُمّت تھے۔ صاحبِ تصانیف بھی ہیں۔

* حافظ گنجی کفایہ ص ۲۸۶ پر رقم طراز ہیں کہ مجھے میرے سید و شیخ بقیۃ السلف علامۃ الزمان، شافعی العصر حجۃ الاسلام شیخ المذاہب ابو محمد عبداللہ بن ابی الوفاء البادرائی نے حافظ ابی محمد عبدالعزیز بن الاخضر کی طرف سے خبر دی ہے کہ انھیں ابوالفتح کروخی نے خبر دی ہے ـــــ اس کے علاوہ قاضی عالم صدر الشام ابو العرب اسماعیل بن حامد بن عبدالرحمٰن الخزرجی نے، انھیں ابوالحفص عمر بن محمد بن معمر نے۔ انھیں ابوالفتح عبدالملک کروخی نے، انھیں قاضی ابو عامر محمود بن القاسم وغیرہ نے، انھیں ابو محمد جراحی نے، انھیں ابوالعباس محمد محبوبی نے، انھیں امام حافظ ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ نے، انھیں ابو سعید الاشج نے مذکورہ اسناد و الفاظ سے خبر دی ہے اور یہ فرمایا ہے کہ یہ الفاظ جامع میں ترمذی کے ہیں جس کی روایت احمد نے مسند میں اور حاکم نے مستدرک میں کی ہے۔

شیوخ گنجی :

۱۔ ابو محمد نجم الدین عبداللہ بن ابی الوفاء البادرائی الشافعی الفرضی المتوفی ۶۵۵ھ امام فقیہ عالم، دیندار، صدر محتشم، جلیل القدر تھے۔

۲۔ الحافظ ابی محمد بن الاخضر عبدالعزیز بن محمود الجنابذی الحنبلی البغدادی

المتوفی ۶۱۱ھ۔ ابن نجار کا بیان ہے کہ میں نے ان کے سامنے بہت سی بڑی بڑی کتابیں پڑھی ہیں، ان کے مجموعے بھی پڑھے ہیں۔ وہ ثقہ حجت شریف تھے۔ سفر و حضر میں ان کا جیسا شیخ نہیں دیکھا۔ ان کے مسموعات زیادہ تھے، شیوخ کے بارے میں معرفت کامل، اصولِ حفظ و احتیاط میں پختہ تھے۔ امین متدین تھے۔ ابن نقطہ کا کہنا ہے کہ یہ ثقہ ثبت، مامون، کثیر السماع، واسع الروایۃ، صحیح الاصول تھے۔ ابن الدبیثی کا ارشاد ہے کہ یہ ثقہ صدوق، صاحبِ معرفت تھے۔ ان سے زیادہ وافر الشیوخ، اعز السماع، عارف الحدیث، فہیم میں نے نہیں دیکھا۔

۳۔ ابو الفتح عبد الملک بن ابی القاسم بن عبد اللہ بن ابی سہیل کرخی متوفی ۵۴۸ھ۔ آپ سے سمعانی وغیرہ نے جامع ترمذی میں سماع کیا ہے۔ شیخ صالح کثیر الخیر تھے۔

۴۔ ابو العرب اسماعیل بن حامد بن عبد الرحمٰن خزرجی شافعی متوفی ۶۵۳ھ۔ قاضی، فقیہ، وکیل بیت المال فی الشام تھے۔

۵۔ ابو حفص عمر بن محمد بن معمر ابن طبرزد البغدادی نزیل دمشق متوفی ۶۰۷ھ۔ ۹۰ برس ۷ ماہ کی عمر پائی۔ سند کبیر اور آفاق پیما تھے۔

۶۔ ابو عامر محمود بن القاسم بن ابی منصور الازدی الہروی الفقیہ الشافعی المتوفی ۴۸۷ھ ترمذی کی جراحی سے روایت کی ہے۔ بقول ابو نصر الفامی عدیم النظیر زاہد و صالح و عفیف تھے۔

۷۔ ابو محمد عبد الجبار بن محمد بن عبد اللہ بن محمد بن ابی الجراح المروزی الجراحی المتوفی ۴۱۲ھ۔ صالح ثقہ تھے اور کتاب ابی عیسیٰ ترمذی کو ابو العباس محبوبی سے روایت کرتے تھے۔

۸۔ ابو العباس المحبوبی محمد بن احمد بن محبوب المروزی المتوفی ۳۴۶ھ۔ ۹۷ برس کی عمر پائی۔ مرو کے محدث و شیخ و رئیس تھے۔ جامع ترمذی کو اصل مؤلف سے روایت کرتے تھے۔

بقیہ مصادر:

جامع الاصول ابن اثیر بحوالہ ترمذی ـــــ اسد الغابہ ۲/۲۲ بالاسناد ـــــ المختار

فی مناقب الاخیار المخطوط ! ـــ ذخائر العقبیٰ ص ۱۴۸ ـــ تیسر الوصول لابن الدبیع ۴/۲۷۴، نزہۃ الابرار للارزنجانی مخطوط ـــ نظم الدرر زرندی ص ۲۱۷، مطالب السؤل لابن طلحہ ص ۱۷، مشکوٰۃ المصابیح ۲/۱۷۱، تاریخ الخلفاء السیوطی ص ۱۲۹، الخصائص الکبریٰ سیوطی ۲/۱۲۶، صواعق ص ۱۱۵ ـــ الصراط السوی للشیخانی مخطوط ـــ بہجۃ المحافل ۲/۲۳۶۔

مصادر احوال رواۃ :

تاریخ البخاری الکبیر ۲ ق ۱/۲۹۶، ۲ ق ۲/۹۔

الجرح والتعدیل ا ق ۲/۵۰۸، ۲ ق ۱/۱۰۶، ۲ ق ۲/۷۳، ۴ ق ۱/۵۲۔

تاریخ بغداد ۱۴/۲۳۱، ۲۳۴۔

المنتظم ۶/۲۳۵۔

انساب السمعانی اللباب ۱/۲۱۷، ۳/ ۳۹، ۱۰۴۔

طبقات السبکی ۵/۵۹۔

تذکرۃ الحفاظ ذہبی ۲/۲۱۰، ۳۰۵، ۴/۱۷۰، ۱۷۲۔

تکملہ ابن صابونی ۱۳، ۲۹، ۱۷۴۔

معجم البلدان ۷/۲۴۔

تاریخ ابن خلکان ۳/۱۲۴۔

تاریخ ابن کثیر ۱۱/۱۶۶۔

ذیل طبقات الحنابلہ لابی الفرج الحنبلی ۲/۷۹۔

النجوم الزاہرۃ ۵/۱۱۰، ۶/۲۰۱، ۲۱۱، ۷/۳۵، ۶۵۵۔

تہذیب التہذیب ۳/۲۷۵، ۴/۱۸۱، ۵/۲۲۶، ۹/۲۸۵۔

لسان المیزان ۲/ ۲۵۱۔

شذرات الذہب ۲/۱۱۹، ۲۲۶، ۲۷۳، ۳/۲، ۱۴۰، ۱۹۵، ۲۸۲، ۳۴۲، ۵/۲۶، ۴۶-۴۷، ۲۶۰-۲۶۱، ۲۶۹۔

ماتمِ یومِ عاشورا کے اسنادِ دیگر

حافظ ابن عساکر "تاریخ دمشق" میں ام الکتاب سے نقل کرتے ہوئے امام حسینؑ کے حالات میں رقم طراز ہیں کہ مجھے ابو محمد بن طاؤس نے، انھیں ابو الغنائم بن ابی عثمان نے، انھیں ابو الحسین بن بشران نے، انھیں حسین بن صفوان برذعی نے، انھیں عبداللہ بن ابی الدنیا نے، انھیں عبداللہ بن محمد بن ہانی ابو عبدالرحمٰن کوفی نے، انھیں سعدی بن سلیمان نے، انھیں علی بن زید بن جذعان نے خبر دی ہے کہ ابن عباس نے نیند سے چونک کر اناللہ کہا اور کہا کہ خدا کی قسم حسینؑ شہید ہو گئے۔ اصحاب نے کہا ہرگز نہیں۔ ابن عبّاس نے فرمایا کہ میں نے رسول اکرمؐ کو خواب میں دیکھا ہے۔ آپؐ کے پاس ایک شیشہ تھا جس میں خون تھا۔ آپؐ نے فرمایا کہ تمھیں نہیں معلوم کہ میری اُمّت نے میرے بعد کیا کیا؟ میرے فرزند حسینؑ کو قتل کر دیا۔ یہ حسینؑ اور ان کے اصحاب کا خون ہے جسے میں بارگاہِ احدیت میں لے جا رہا ہوں۔ چنانچہ وہ دن اور وقت نوٹ کر لیا گیا۔ ۲۴ دن کے بعد مدینہ میں خبر آئی کہ امام حسینؑ اُسی دن اور اُسی وقت شہید ہوئے تھے۔

سید شیخانی نے الصراط السوی میں اس روایت کو نقل کرنے کے بعد تحریر فرمایا ہے کہ احمد کی روایت میں ہے کہ ابن عبّاس قیلولہ کر رہے تھے۔ اب جو چونکے تو زبان پر کلمۂ اناللہ تھا۔ گھر والے گھبرا گئے۔ پوچھا آخر یہ کیا ہے؟ ابن عبّاس نے کہا، میں نے پیغمبرؐ اسلام کو خواب میں دیکھا ہے کہ آپ زمین سے کچھ اٹھا رہے تھے۔ میں نے عرض کی حضورؐ میرے ماں باپ قربان یہ کیا ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا یہ حسینؑ کا خون ہے جسے بارگاہِ احدیت میں لے جا رہا ہوں۔

اسنادِ حافظ:

۱۔ ابو محمد ہبۃ اللہ بن احمد بن عبداللہ بن علی بن طاؤس المقری البغدادی

المتوفی ۵۳۶ھ۔ ثقہ صدوق، قاری فاضل، امام عالم، محقق محتاط، صالح ورع تھے۔ ذہبی، ابن الجوزی، ابن الجزری وغیرہ نے توثیق کی ہے۔ (المنتظم ۱/۱۰۱، طبقات القراء ۲/۴۴۹، النجوم الزاہرۃ ۵/۲۷۰، شذرات ۴/۱۱۴)۔

۲۔ ابو الغنائم ابن ابی عثمان محمد بن علی بن الحسن البغدادی المتوفی ۴۸۳ھ ابن جزری نے المنتظم ۹/۵۴ پر نقل کیا ہے کہ ہمارے شیوخ نے ان سے حدیث لی ہے اس لئے کہ وہ ثقہ متدین تھے۔

۳۔ ابو الحسین بن بشران علی بن محمد بن عبد اللہ بن بشران بن محمد الاموی البغدادی المتوفی ۴۱۵ھ خطیب نے تاریخ بغداد ۱۲/۹۸-۹۹ پر اپنے مشائخ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میں نے ان سے روایتیں لکھی ہیں اس لئے کہ وہ ثقہ صدوق، حسن الاخلاق، تام المروۃ، ظاہر الدیانہ تھے۔ ابن الجزری نے المنتظم ۸/۱۸ پر ثقہ صدوق لکھا ہے۔ شذرات ۳/۲۰۲ پر بھی ان کے حالات درج ہیں۔

۴۔ ابو علی الحسین بن صفوان بن اسحاق برذعی المتوفی ۳۴۰ھ خطیب نے تاریخ بغداد ۸/۵۴ پر ان کے مشائخ و رواۃ کا ذکر کرتے ہوئے انھیں صدوق لکھا ہے۔ شذرات میں بھی ان کے حالات درج ہیں۔

۵۔ عبد اللہ بن محمد بن عبید ابو بکر القرشی المعروف بابن ابی الدنیا مولیٰ بنی امیہ المتوفی ۲۸۱ھ۔ حافظ ابن ابی حاتم نے الجرح والتعدیل ۲ ق ۲/۱۶۳ پر ان کے حالات میں لکھا ہے کہ میں نے اور میرے والد نے ان کی حدیثیں لکھی ہیں اور میرے والد نے انھیں انھیں بغدادی صدوق سے تعبیر کیا ہے۔ تاریخ بغداد ۱۰/۸۹، المنتظم ۵/۱۴۸ پر آپ کے حالات میں درج ہے کہ آپ صاحب مروت ثقہ صدوق تھے۔ زہد پر سو سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں۔

۶۔ عبد اللہ بن محمد بن ہانی ابو عبد الرحمٰن النحوی النیشاپوری، صاحب الاخفش متوفی ۲۳۶ھ خطیب نے ان کے مشائخ کا ذکر کرتے ہوئے انھیں ثقہ لکھا ہے۔ تاریخ بغداد ۱۰/۷۲-۷۳، انبار الرواۃ للقفطی ۲/۱۳۱، بغیۃ الوعاۃ ص ۲۹۰۔

۷۔ معدی بن سلیمان ابو سلیمان صاحب الطعام۔ رجال ترمذی و ابن ماجہ میں ہیں۔

ابو حاتم نے شیخ لکھا ہے۔ شاذکونی نے افضل الناس اور ابدال میں شمار کیا ہے۔ ابن حجر کا بیان ہے کہ ترمذی نے آپ کی حدیث کی صحت کا اعتراف کیا ہے۔

۸۔ علی بن زید بن جدعان ابو الحسن بصری متوفی ۱۲۹ھ۔ تابعی ثقہ۔ صحاح ستّہ کے راوی ہیں۔ بخاری نے صحیح کے بجائے تاریخ میں حدیث لی ہے۔ مفصّل حالات الغدیر کی مسند انس و براء و حضرت علیؑ میں مذکور ہیں۔

منزلِ آخر

ماتمِ حسینؑ وہ ماتم ہے جو نسلوں کے ساتھ تازہ اور زمانوں کے ساتھ زندہ رہے گا۔ نہ زمانے اس کی تازگی میں فرق لا سکتے ہیں اور نہ حالات اس کی زندگی میں ضعف ـــــ جب تک اسلام کا کلمہ بلند، محمدؐ کا نام باقی، دین کا پرچم کشادہ، اللہ کی کتاب قابلِ توجہ اور رسولؐ کی سنّت لائقِ اتباع ہے اور دونوں میں عترتِ مصطفےٰؐ کی محبت کے واجب حتمی ہونے کا تذکرہ موجود ہے۔ کسی مسلمان کو اس محبت سے نہ مفر ہے، نہ چھٹکارا، نہ بچاؤ کی کوئی صورت ہے نہ فرار کی۔ اجرِ رسالت دینا پڑے گا اور حقوقِ آلِ محمد ادا کرنے پڑیں گے یہ حق کسی ایک زمانے یا اُمت سے مخصوص نہیں ہے۔ تو ہیں اس منزل میں مساوی اور نسلیں اس میدان میں برابر ہیں۔ حسینؑ کا غم اس وقت تک دائم و قائم رہے گا جب تک کہ پہلو ان کی محبت سے معمور اور سینے ان کی مودّت سے آباد ہیں۔

کتاب و سنّت میں اتفاقی طور پر پیغمبرِ اسلام کی تاسّی کو واجب و فرض قرار دیا گیا ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ حضورؐ نے اپنی پوری زندگی مضطرب، رنجیدہ، غم رسیدہ اور درد انگیز انداز سے گذاری ہے جس دن سے خواب میں بنی امیہ کے افراد کو اپنے منبر پر اُچھلتے دیکھا ہے، نہ دل کو قرار نصیب ہوا ہے اور نہ لبوں کو تبسّم۔ (دلائل النبوۃ بیہقی ـــــ الموجودۃ عندنا و للہ الحمد)

خود حسینؑ کا گریہ ہی حضرتؐ کے اضطراب کے لئے کیا کم تھا جیسا کہ حافظ ابوالقاسم طبرانی نے المعجم الکبیر میں یزید بن ابی زیاد کے طریقِ صحیح سے روایت کی ہے کہ حضورِ اکرمؐ عائشہ کے گھر سے نکل کر حضرت فاطمہؑ کے گھر کی طرف تشریف لے گئے تو حسینؑ کو روتا ہوا پایا۔ آپؐ نے فرمایا بیٹی! اس بچّہ کو خاموش کرو اس کے رونے سے مجھے تکلیف ہوتی ہے۔

ظاہر ہے کہ جب حضرتؐ کو حسینؑ کے رونے سے تکلیف ہوتی ہے تو آپ کا اس وقت کیا عالم ہوگا۔ جب آپ اس حسینؑ کو پارہ پارہ خاک و خون میں آلودہ، صحرا میں افتادہ دیکھیں گے۔ رخساروں پر خاک ہوگی، گلے سے خون جاری ہوگا۔ تن سے سر جدا ہوگا اور سر سے عمامہ الگ۔ گرد صحرا بڑھ بڑھ کے پردہ پوشی کر رہی ہوگی۔

اس وقت کیا حال ہوگا جب آپ اپنے حسینؑ کو مذبوح و عطشان و وحید و غریب دیکھیں گے۔ جگر پیاس سے شگافتہ ہوگا اور اعضاء و جوارح گھوڑوں کی ٹاپوں سے پامال ـــــ آہ ـــــ آہ ـــــ وا اسفاہ حسینؑ کا جسم خاکِ کربلا پر افتادہ اور حسینؑ کا سر نوکِ نیزہ پر دیار بہ دیار۔

حیف صد حیف! حسینؑ کے اہلِ حرم غلاموں کی طرح اسیر ہوں۔ انھیں زنجیروں میں جکڑا جائے، صحراؤں میں پھرایا جائے اور وہ بھی ایسے ناقوں پر جن پر محملیں نہ ہوں اور حرارتِ صحرا، تمازتِ آفتاب ان پر سایہ فگن ہو۔ افسوس صد افسوس! آج بناتِ پیغمبرؐ کی آواز نالہ و گریہ بھی بلند ہے اور وہ اپنے شہیدوں کا ماتم بھی کر رہی ہیں۔

ظاہر ہے کہ نبیؐ کی ساری زندگی حزن والم میں گذر جائے، آپ کی حیاتِ طیبہ سے راحت و سکون اٹھ جائے۔ آپ قبل از واقعہ حسینؑ کے لئے ماتم کرتے رہیں تو آپ کی تصدیق و تائید کے بعد آپ کے سچّے دوستوں کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ آپ کی پیروی میں صبح و شام غمِ حسینؑ میں رنجیدہ رہیں۔ ان کا گریۂ و نالہ اس ماتم میں دائمی اور سرمدی بن جائے جیسا کہ فقیہ ابن المغازلی نے "المناقب" میں تحریر فرمایا ہے کہ حسینؑ کی قبر کے گرد چالیس ہزار ملائکہ جمع رہتے ہیں جن کے بال پریشان اور سروں پر خاک ہوتی ہے اور یہ قیامت تک حسین پر روتے رہیں گے۔ (کتاب المناقب میرے پاس موجود ہے۔)

گویا قدرت نے مشہدِ حسینؑ کو دار الحزن اور عزاخانۂ ملائکہ قرار دیا ہے۔ اس نے حسینؑ کا خون اپنے خزانے میں محفوظ کر لیا ہے جس وقت سے حسینؑ نے اپنے سینے کا خون چُلّو میں بھر کر آسمان کی طرف پھینکا ہے اور اس کا کوئی قطرہ واپس نہیں آیا۔ رسولِ اعظمؐ نے بھی روزِ عاشور حسینؑ اور ان کے اصحاب کے خون کو ایک شیشے میں جمع کر کے بارگاہِ احدیت

میں پیش کیا ہے۔

ان تمام باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حسینؑ کے غم کی مدت سرحدِ قیامت سے ملی ہوئی ہے۔ یہ آنسو اس وقت تک بہتے رہیں گے جب تک کہ عرصۂ محشر میں ایک عمومی مجلس تشکیل نہ پا جائے اور اس میں صدیقۂ طاہرہ فاطمہ زہراؑ اُمّ الحسین، حسینؑ کے خون آلود لباس کو بارگاہِ احدیت میں نہ پیش کر دیں جیسا کہ فقیہ ابن المغازلی نے المناقب میں اور حافظ جنابذی حنبلی ابن الاخضر نے معالم العترۃ میں مرفوعاً طریق امیر المومنینؑ سے حضورؐ سے روایت کی ہے کہ میدانِ حشر میں میری بیٹی فاطمہؑ اس عالم میں آئے گی کہ اس کے ساتھ حسینؑ کے خون سے رنگین کپڑے ہوں گے۔ قائمہ عرش کو پکڑے گی اور کہے گی اے جبّار! میرے اور میرے لال کے قاتل کے درمیان فیصلہ کر دے! خدا کی قسم اس وقت خدا میری بیٹی کے حق میں فیصلہ کرے گا۔" (جنابذی شذرات کے قول کی بنا پر ایک بے مثل عالم متدین، امین تھے۔ ۵/۴۶-۴۷)

سید محمود شیخانی نے الصراط السوی میں اسی حدیث کے ذریعہ سلیمان بن یسار ہلالی کے ان اشعار پر استدلال کیا ہے جو انھوں نے ایک پتھر پر کندہ دیکھے تھے۔

یہ ضروری ہے کہ فاطمہؑ روزِ قیامت حسینؑ کی خون آلود قمیص لے کر وارد ہوں اور حیف ہے اس کے لئے جس کی شفاعت کرنے والے ہی اس کے حریف ہو جائیں ــــ اور صورِ اسرافیل تو بہر حال پھونکا جائے گا۔

یہ خونِ حسینؑ اور لباسِ مظلوم کا محفوظ کر لیا جانا عربی اصولوں سے اس بات کی علامت ہے کہ ابھی اس خون کا بدلہ نہیں لیا گیا ہے اور ولی و وارث زمانے کے اعتبار سے قاتل تک نہیں پہنچ سکا۔ ظاہر ہے کہ جب تک انتقام نہ ہو جائے زخم کا اندمال کہاں؟ جب تک خدائے عادل کا فیصلہ نہ ہو جائے دلوں کو قرار کہاں؟ نفس کا سکون، قلب کا قرار اور آتشِ غم کی خاموشی اسی وقت ممکن ہے جب قاتل اپنے کیفرِ کردار تک پہنچ جائے۔

وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَنْقَلِبُونَ۔

وظائف و اعمال

مذکورہ بالا صحیح و مستحکم اصولوں کی بنا پر یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ غمِ حسینؑ کے سلسلے میں حسب ذیل باتیں سنّتِ پیغمبرؐ میں داخل ہیں جن سے کسی مسلمان کے لئے فرار کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

۱۔ مصائبِ اہلبیتؑ کو تمام مصائب سے بالاتر اور اپنے اہل و عیال، مال و منال سے زیادہ اہم سمجھنا چاہیئے۔ اس لئے کہ مردِ مومن کے ایمان میں شرطِ کمال یہی ہے کہ وہ عترتِ پیغمبرؐ کو اپنے اہل و مال سے زیادہ اہم سمجھے اور ظاہر ہے کہ احساسِ محبت کا تعین محبت کے درجات کے اعتبار سے ہوتا ہے۔

۲۔ اہلبیتؑ کے مصائب پر گریہ کرنا اور ان کے مصائب پر آنسو بہانا چاہیئے۔

۳۔ امام حسینؑ پر ان کے روزِ ولادت و شہادت، ان کی خاکِ تربت دیکھ کر اور کربلا پہنچ کر گریہ کرنا چاہیئے۔ اس لئے کہ مصیبتِ حسینؑ نے پیغمبرِ اکرمؐ کو مدّتوں رُلایا ہے۔ کبھی امہات المومنین کے گھر میں، کبھی مجمعِ اصحاب میں، کبھی خاکِ کربلا دیکھ کر اور کبھی اسے سونگھ کر۔ اور یہ سب قبلِ وقوعِ واقعہ تھا تو ظاہر ہے کہ وقوعِ واقعہ کے بعد آپ کا کیا حال ہوا ہوگا؟ مسلمانوں کا فرض ہے کہ اس سیرتِ پیغمبرؐ پر عمل کرتے ہوئے حسینؑ کا ماتم کرتے رہیں۔ مصیبتِ کربلا وہ مصیبت تھی جس نے اُمّتِ پیغمبرؐ کے نام کو بدنام کر دیا۔ اس کی تاریخ کے اوراق کو سیاہ کر دیا، اس لئے کہ اس سے پہلے کسی اُمّت نے بھی اتنا بڑا جُرم نہیں کیا تھا جتنا بڑا جرم اس اُمّت نے کیا ہے اور یہی وجہ تو تھی کہ راس الجالوت محمد بن عبد الرحمٰن نے برسرِ دربار کہہ دیا تھا کہ میرے اور حضرت داؤدؑ کے درمیان ستّر پُشتوں کا فاصلہ ہے لیکن یہودی میری تعظیم و تکریم کرتے ہیں، اور تم لوگوں نے تو

اپنے نبیؐ کے نواسے ہی کو ذبح کر دیا۔

اس لئے اُمّت کا فرض ہے کہ وہ آنسو بہا کر اُمّت کے نام سے اس دھبّہ کو دھوئے اور پیغمبرِ اسلام کو یہ تسلّی دے کہ آج کی اُمّت کربلا والی نہیں ہے۔ وہ قسی القلب اور سنگدل مجرم تھے۔ ہمارے پہلو میں پتّھر کے بجائے دل ہے۔

۴۔ گھروں میں وقتاً فوقتاً ماتم منعقد کر کے لوگوں کو اس واقعہ کی اطلاع دینا۔

۵۔ خاکِ کربلا کو سونگھنا اور اسے ہاتھوں ہاتھ گردش دینا۔

۶۔ خاکِ کربلا کو کپڑے میں رکھ کر محفوظ کرنا اور اس پر نظر کرتے رہنا۔

۷۔ روزِ عاشور کو روزِ حزن و بکا قرار دینا۔ اس دن بالوں کو پریشان و خاک آلود کر کے سوگواروں کی ہیئت بنانا۔

ہم نے پچاس سال قبل تک زعمارِ ملّت، علمارِ دین، رؤسارِ قوم، رجالِ مذہب، ملوک و وزرا کو روزِ عاشورا اسی ہیئت میں دیکھا ہے۔ اس وقت ہر شخص رنجیدہ، گریہ کناں اور حزیں دکھائی دیتا تھا۔ لیکن جب سے مہمل تمدّن اور کھوکھلی تہذیب نے اسلامی معاشرہ پر اپنا منحوس سایہ ڈالا ہے۔ یہ سیرتِ پیغمبرؐ بھی اوہام کا شکار ہو گئی۔ شہروں کی حالت دگرگوں ہو گئی۔ اُمّت کے لئے طریقۂ رسالت کا اختیار کرنا معیوب ہو گیا اور استعماری معاشرہ کی شرم و حیا نے سنّتِ پیغمبرؐ کو نذرِ طاقِ نسیاں بنا دیا۔

۸۔ کربلائے معلّٰی میں گریہ کن، رنجیدہ، محزون ہو کر حاضر ہونا جس انداز سے روزِ عاشور حضورِ اکرمؐ تشریف لائے تھے۔

یہ ہے حسینؑ ــــ ان کا ماتم ــــ ان کی خاکِ تربت ــــ اور ان کی کربلا۔

رہ گیا خاکِ شفا پر سجدہ ــــ تو ــــ اسلامی تاریخ میں روزِ ازل سے یہ بات مُسلّم ہے کہ ہر مسلمان نمازی کو خاک پر سجدہ کرنا چاہئے۔ حضورِ اکرمؐ کی مرفوع حدیث "زمین میرے لئے سجدہ گاہ بھی ہے اور طہور بھی"۔ ایک مسلّم الثبوت حدیث ہے جس پر تمام ائمۂ مذاہب کا اتفاق ہے اور اختیاری حالات میں ہر آدمی مجبور ہے کہ وہ زمین پر سجدہ کرے یا اس سے اُگنے والی چیز پر۔ صحابۂ کرام کا دستور تھا کہ گرمی کے زمانے میں مسجد کی کنکریاں اُٹھا کر

انھیں ہاتھوں سے رگڑ کر ٹھنڈا کیا کرتے تھے اور اس پر سجدہ کیا کرتے تھے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سجدہ کے لئے خاک کا فراہم کرنا ضروری ہے، چاہے اس میں زحمت و مشقت ہی کیوں نہ ہو۔ خود حضورِ اکرمؐ کے بارے میں بھی ہے کہ آپ شدتِ گرما میں یا شدتِ سرما میں ہاتھوں کے نیچے کپڑا بچھایا کرتے تھے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پر سجدہ نہیں فرماتے تھے ورنہ اس کا ذکر بھی ہوتا۔ رہ گیا عدمِ امکانِ خاک تو ایسی حالت میں غیر خاک پر بھی سجدہ ممکن ہے اس لئے کہ ضرورت میں تو ہر ممنوع چیز مباح ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ روایات جن میں چٹائی، حصیر، خمرہ وغیرہ پر سجدہ کرنے کا ذکر ہے ان سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ زمین سے اُگنے والی چیزوں پر سجدہ کرنا جائز ہے بشرطیکہ وہ کھانے اور پہننے کے استعمال کی نہ ہوں ـــــ یہ اور بات ہے کہ سجدہ کی حقیقت، عظمتِ مولیٰ کے سامنے احساسِ ذلت و حقارت کا تقاضا یہی ہے کہ سجدہ زمین پر کیا جائے تاکہ رخسارہ خاک پر رکھا جائے، ناک مٹی پر رگڑی جائے اور انسان کو اپنی اس بنیادی مٹی کا احساس بھی پیدا ہو جس سے اس کی خلقت ہوئی ہے اور جس میں اسے جانا ہے اور روزِ قیامت دوبارہ اُٹھنا ہے تاکہ روح میں خشوع و خضوع کی کیفیت اور نفس میں ذلت و حقارت کا احساس بیدار ہو سکے، اعضاء و جوارح عبادت کی طرف مائل ہوں اور انانیت و تکبر کا خاتمہ ہو جائے۔ انسان کو یہ لحاظ رہے کہ مٹی سے پیدا ہونے والی مخلوق کو ذلت و مسکنت کے علاوہ اور کوئی شے زیب نہیں دیتی ہے ـــــ ظاہر ہے کہ یہ اسرار و رموز اونی، سوتی کپڑوں یا ریشمی سجادوں میں نہیں پیدا ہو سکتے ہیں۔ یہ چیزیں ان اسبابِ راحت و آرام میں ہیں جن سے انسان میں اپنی عظمت و برتری کا احساس پیدا ہوتا ہے اور وہ اپنے بارے میں بھی کچھ سوچنے لگتا ہے جب کہ سجدہ اپنے کو بھول کر خالق کو یاد کرنے کا نام ہے۔

اب ہم ناظرین کرام کے سامنے ان تمام احادیث و روایات کو رکھ دینا چاہتے ہیں جن میں سجدہ کے احکام بیان کئے گئے ہیں چاہے وہ صحاح ستہ میں ہوں یا دوسری مستند حدیث کی کتابوں میں، تاکہ آپ انھیں کی روشنی میں اپنی تکلیف معین کریں اور اپنے نبیِ اعظمؐ کی پیروی کا حق ادا کریں۔ ایسی روایات کی تین قسمیں ہیں:

قسم اوّل: وہ روایات ہیں جن میں زمین پر سجدہ کرنے ہے، جیسے:

۱۔ زمین کو میرے لئے سجدہ گاہ بھی بنایا گیا ہے اور وسیلۂ طہارت بھی۔

بقول مسلم "ہمارے لئے پوری زمین سجدہ گاہ ہے اور اس کی خاک وسیلۂ طہارت ہے اگر پانی موجود نہ ہو"

بروایتِ ترمذی: "میرے لئے پوری زمین کو سجدہ گاہ اور وسیلۂ طہارت بنایا گیا ہے"۔ عن علیؑ و عبداللہ بن عمر و ابی ہریرہ و جابر و ابن عبّاس و حذیفہ و انس و ابی امامہ و ابی ذر۔ بیہقی کے الفاظ ہیں: "میرے لئے زمین کو وسیلۂ طہارت اور سجدہ گاہ قرار دیا گیا ہے ـــــ زمین میرے لئے پاک اور سجدہ گاہ بنائی گئی ہے جہاں بھی نماز کا وقت آجائے وہیں نماز پڑھ لو۔" (بخاری ص ۸۶، ۱۱۳۔ مسلم ۲/ ۶۴۔ نسائی ۲/ ۳۲۔ صحیح ابی داؤد ۱/ ۷۹۔ ترمذی ۲/ ۱۱۴۔ السنن الکبریٰ ۲/ ۴۳۲۔ ۴۳۵)

۲۔ پیغمبرِ اسلامؐ نے جناب ابوذر سے فرمایا۔ "زمین تمھارے لئے مسجد ہے، جہاں نماز کا وقت آجائے وہیں پڑھ لو۔" (صحیح نسائی ۲/ ۳۲)

۳۔ "ابن عبّاس کا بیان ہے کہ حضور اکرمؐ نے پتّھر پر سجدہ فرمایا تھا۔" (مستدرک حاکم ۳/ ۴۷۳)۔ یہ روایت حاکم اور ذہبی دونوں کے نزدیک صحیح ہے۔

۴۔ ابوسعید الخدری کہتے ہیں کہ میں نے اپنی آنکھوں سے حضورِ اکرمؐ کی پیشانی اور ناک پر مٹّی اور پانی کے اثرات دیکھے ہیں۔ (بخاری ۱/ ۱۶۳۔ ۱۹۸، ۲/ ۲۵۳۔ ۲۵۴۔ ۲۵۶۔ ۲۵۸۔ ۲۵۹)۔ (سنن ابی داؤد ۱/ ۱۴۳۔ ۱۴۴، السنن الکبریٰ ۲/ ۱۰۴)

۵۔ رفاعہ بن رافع نے مرفوعاً نقل کیا ہے کہ "حضرت نماز میں تکبیر کہہ کر سجدے میں جاتے تھے اور پیشانی کو خاک پر رکھ کر تمام اعضاء کو پُرسکون طریقہ پر رکھتے تھے۔" (سنن کبریٰ و بیہقی ۲/ ۱۰۲)

۶۔ ابن عبّاس، انس و بریدہ سندِ صحیح کے ساتھ روایت کرتے ہیں کہ "تین چیزیں ظلم ہیں۔ نماز سے فارغ ہونے سے پہلے پیشانی کا پونچھ ڈالنا" ـــــ یا بالفاظ واثلہ بن

اسقع: "انسان کو نماز ختم ہونے سے پہلے پیشانی کی خاک کو نہیں پونچھنا چاہئے"
(البزاز الطبرانی۔ مجمع الزوائد ص ۸۳-۸۴)

۷۔ جابر بن عبداللہ کہتے ہیں کہ "میں رسولِ اکرمؐ کے ساتھ نمازِ ظہر پڑھتا تھا تو ایک مٹھی سنگریزے لے کر ہاتھ میں ٹھنڈے کر لیا کرتا تھا تاکہ شدتِ گرما میں بھی سجدہ کر سکوں"
—— یا بالفاظِ احمد: "جب میں حضرتؐ کے ساتھ ظہر پڑھتا تھا تو ایک مشت سنگریزے اتنی دیر تک لئے رہتا تھا کہ وہ ٹھنڈے ہو جائیں اور میں گرمی کی شدت میں بھی اپنی پیشانی رکھ کے سجدہ کر سکوں" (مسند احمد ۱/۲۲۷، السنن الکبریٰ ۲/۱۰۵)۔ (بیہقی نے شیخ کا قول نقل کیا ہے کہ اگر اپنے کپڑوں پر سجدہ جائز ہوتا تو سنگریزوں کو ٹھنڈا کر کے ان پر سجدہ کرنے کی ضرورت نہ پڑتی وباللہ التوفیق)۔

۸۔ انس بن مالک کہتے ہیں کہ جب ہم شدید گرمی میں رسولؐ اللہ کے ساتھ نماز پڑھتے تھے تو ریگِ صحرا کو ہاتھ میں لے کر ٹھنڈا کرتے تھے اور پھر اسی پر سجدہ کرتے تھے۔
(السنن الکبریٰ ۲/۱۰۶)

۹۔ خباب بن الارت ناقل ہیں کہ ہم لوگوں نے حضرتؐ کی خدمت میں شدتِ تمازت سے پیشانی اور ہاتھ کے متاثر ہونے کا ذکر کیا تو آپ نے ہماری شکایت کا کوئی اثر نہیں لیا۔
(سنن بیہقی ۲/۱۰۵-۱۰۷، نیل الاوطار ص ۲۶۸)

۱۰۔ عمر بن الخطاب راوی ہیں کہ ایک رات بارش ہوگئی اور زمین گیلی ہوگئی تو لوگوں نے وادی سے سنگ ریزے اُٹھا کر انھیں پر نماز پڑھنا شروع کر دی —— رسولِ اکرمؐ نے یہ عالم دیکھا تو خوش ہوئے۔ فرمایا کیا اچھا یہ فرش ہے۔ یہیں سے سنگریزوں پر نماز کے سجدہ کا آغاز ہوا —— یہی روایت ابوداؤد نے دو ایک لفظوں کے فرق سے ابن عمر سے نقل کی ہے۔ (ابوداؤد ۱/۷۵، السنن الکبریٰ ۲/۴۴۰)

۱۱۔ عیاض بن عبداللہ قرشی راوی ہیں کہ رسول اکرمؐ نے ایک شخص کو عمامے کے کنارے پر سجدہ کرتے ہوئے دیکھا تو آپ نے اشارہ کیا کہ عمامہ اونچا کر کے پیشانی پر سجدہ کرو۔ (السنن الکبریٰ ۲/۱۰۵)

۱۲۔ امیر المومنینؑ فرماتے ہیں کہ نماز پڑھتے وقت عمامہ کو پیشانی سے ہٹا دینا چاہیے۔
(السنن الکبریٰ ۱۰۵/۲)

۱۳۔ نافع ناقل ہیں کہ عبداللہ بن عمر سجدہ کرتے وقت عمامہ کو اونچا کر کے پیشانی پر سجدہ کرتے تھے۔ (السنن الکبریٰ ۱۰۵/۲)

۱۴۔ عبادہ بن صامت کہتے ہیں کہ وہ نماز کے وقت عمامہ پیشانی سے ہٹا دیا کرتے تھے۔ (السنن الکبریٰ ۱۰۵/۲)

۱۵۔ ابو عبیدہ کا بیان ہے کہ ابن مسعود کی نماز یا سجدہ صرف زمین پر ہوا کرتا تھا۔
(معجم کبیر طبرانی، مجمع الزوائد ۵۷/۲)

۱۶۔ ابراہیم کہتے ہیں کہ وہ چٹائی پر کھڑے ہوتے تھے اور خاک پر سجدہ کرتے تھے۔ (طبرانی، مجمع الزوائد ۵۷/۲)

۱۷۔ صالح بن حیوان سبائی ناقل ہیں کہ رسولؐ اللہ کے پہلو میں ایک شخص نماز پڑھ رہا تھا اور اس کا عمامہ پیشانی تک دب گیا تھا۔ حضرت نے خود اپنے دست مبارک سے اونچا کر دیا۔ (سنن بیہقی ۱۰۵/۲، نصب الرایہ زیلعی ۳۸۶/۱)

قسم دوم: وہ روایات جن میں غیر زمین پر بلا عذر سجدے کا ذکر ہے:

۱۔ انس بن مالک کہتے ہیں کہ میری جدہ ماجدہ ملیکہ نے رسول اکرمؐ کو کھانے پر مدعو کیا۔ حضرت نوش فرما چکے تو آپ نے فرمایا کہ اچھا آؤ نماز پڑھ لیں۔ ہم لوگ ایک چٹائی پر کھڑے ہونے لگے جو کہنہ ہو کر میلی ہو گئی تھی۔ میں نے اسے پانی سے صاف کیا تو حضرتؐ اس پر کھڑے ہوئے۔ ہم لوگوں نے صفیں بنائیں، آپ کے پیچھے یتیم اور سب کے پیچھے ضعیفہ۔ (بخاری ۱۰۱/۱، صحیح نسائی ۵۷/۲)

نسائی کے الفاظ یہ ہیں کہ ام سلیم نے حضرتؐ سے اپنے گھر میں نماز ادا کرنے کی خواہش کی تاکہ وہ جگہ مصلیٰ بن جائے، تو حضرت تشریف لے آئے۔ میں نے ایک چٹائی صاف کر کے بچھا دی جس پر حضرتؐ نے بھی نماز ادا کی اور لوگوں نے بھی آپ کے ساتھ نماز پڑھی۔

ابن ماجہ کے الفاظ میں: "میرے بعض ابنائے عم نے حضورؐ کو کھانے پر مدعو کیا تو حضرت تشریف لے آئے۔ اتفاق سے گھر میں ایک چٹائی تھی جو پرانی ہو کر سیاہ ہو گئی تھی۔ آپ نے اس کے ایک کنارے کو صاف کرا کے اس پر پانی چھڑک دیا اور پھر نماز ادا کی۔ ہم لوگوں نے بھی آپ کی اقتدا کی۔" (ابن ماجہ ۱/۲۵۵)

سنن بیہقی ۲/۴۲۱ پر روایت ہے کہ جب آپ ام سلمہ کے یہاں قیلولہ فرماتے تھے تو وہ ایک کھال بچھا دیا کرتی تھیں تا کہ آپ اس پر نماز پڑھ سکیں۔

سنن ہی میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ حضرت کے اخلاقِ کریمانہ اس قدر وسیع و بلند تھے کہ جب ہمارے گھر میں نماز کا وقت آجاتا تھا تو اپنے بستر کی چٹائی کو صاف کرا کے اس پر پانی چھڑک کر نماز پڑھا دیا کرتے تھے۔

سنن ہی میں یہ روایت بھی ہے کہ حضرت ایک گھر میں تشریف لے گئے۔ وہاں کھجور کی ایک چٹائی تھی۔ آپ نے اس پر پانی چھڑک کر نماز ادا فرمائی۔

(ترمذی نے بھی صحیح ۲/۲۸ پر مختصر طور پر اس روایت کو انس سے نقل کیا ہے)

۲۔ ابن عباس راوی ہیں کہ حضور اکرمؐ خُمرہ پر نماز ادا کیا کرتے تھے۔ (ترمذی ۲/۱۲۶، ابن عربی مالکی کا ارشاد ہے کہ "خُمرہ" نماز کی چٹائی کو کہتے ہیں۔)

۳۔ ابو سعید خدری حضورؐ کے پاس پہنچے تو آپ نماز پڑھ رہے تھے اور چٹائی پر سجدہ فرما رہے تھے۔ (صحیح مسلم ۲/۶۲۔۱۲۸، ابن ماجہ ۱/۳۲۱، جامع ترمذی ۲/۱۲۷)

۴۔ ام المومنین میمونہ راوی ہیں کہ حضرتؐ نماز ادا فرما رہے تھے۔ میں آپ کے بالکل قریب بیٹھی ہوئی تھی۔ آپ خُمرہ پر نماز پڑھ رہے تھے۔ (بخاری ۱/۱۰۱، مسلم ۲/۱۲۸، ابن ماجہ ۱/۳۲۰، نسائی ۲/۵۷، بیہقی ۲/۴۲۱)

مسلم نے حضرت عائشہ سے روایت کی ہے کہ رسولِ خدا نے مجھ سے فرمایا کہ میرا خُمرہ لے آؤ، تو میں نے عرض کی حضورؐ میں حالتِ حیض میں ہوں۔ آپؐ نے فرمایا کہ نجاست تمہارے ہاتھ میں تو ہے نہیں۔ (مسلم ۱/۱۶۸)

۵۔ ابن عمر کا بیان ہے کہ رسول اکرمؐ خُمرہ ہی پر نماز پڑھتے تھے اور خُمرہ ہی پر

سجدہ فرماتے تھے۔ (طبرانی، معجم کبیر و اوسط)

۶۔ جناب ام سلمہ ناقل ہیں کہ حضرتؐ کے پاس ایک حصیر اور ایک خُمرہ تھا، اسی پر نماز پڑھا کرتے تھے۔ (اس روایت کو ابو یعلیٰ اور طبرانی نے معجم کبیر و اوسط میں نقل کیا ہے اور ابو یعلیٰ کے راوی صحیح کے راوی ہیں۔ ام حبیبہ نے بھی ایک ایسی ہی صحیح روایت بیان کی ہے جیسا کہ مجمع الزوائد ۵۷/۲ میں مذکور ہے۔)

۷۔ انس کا بیان ہے کہ حضور اکرمؐ خمرہ ہی پر نماز پڑھتے تھے اور اسی پر سجدہ کرتے تھے۔ اس روایت کو طبرانی نے اوسط و صغیر میں مختلف اسناد سے نقل کیا ہے جن میں بعض اسناد صحیح اور ان کے رجال ثقہ ہیں۔ (مجمع الزوائد ۵۷/۲)

قسم سوم: وہ روایات جن میں عذر کی موجودگی میں غیر زمین پر سجدے کا ذکر ہے۔

۱۔ انس بن مالک کا بیان ہے کہ ہم لوگ جب شدتِ گرما میں حضرتؐ کے ساتھ نماز پڑھا کرتے تھے اور زمین پر پیشانی رکھنے کی ہمت نہ کرتے تھے تو اپنا کپڑا ڈال کر اسی پر سجدہ کر لیا کرتے تھے۔

بالفاظِ بخاری: "جب ہم حضرتؐ کے ساتھ نماز پڑھتے تھے تو گرمی کی شدت سے کپڑے کو سجدہ کی جگہ رکھ کر اس پر سجدہ کر لیا کرتے تھے۔"

بالفاظِ مسلم: "جب ہم شدتِ گرما میں حضورؐ کے ساتھ نماز پڑھتے تھے اور ہم میں سے کوئی خاک پر پیشانی رکھنے کی طاقت نہ رکھتا تھا تو اپنا کپڑا بچھا کر اسی پر سجدہ کر لیا کرتا تھا۔"

دوسرے الفاظ میں: "جب ہم حضورؐ کے ساتھ نماز پڑھتے تھے تو بعض لوگ شدتِ حرارت سے کپڑے کا کنارا سجدہ گاہ کی جگہ پر رکھ لیا کرتے تھے۔" (بخاری ۱۰۱/۱، مسلم ۱۰۹/۲، ابن ماجہ ۳۲۱/۱، ابو داؤد ۱۰۶/۱، سنن دارمی ۳۰۸/۱، مسند احمد ۱۰۰/۱، السنن الکبریٰ ۱۰۶/۲، نیل الاوطار ۲۶۸/۲)

علامہ شوکانی کا ارشاد ہے کہ اس حدیث مبارک سے ظاہر ہوتا ہے کہ شدتِ گرما

میں کپڑے پر سجدہ کرنا جائز ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اصل خاک پر سجدہ کرنا ہے اور عدم امکان کی صورت میں کپڑے کا سہارا لیا جا سکتا ہے بلکہ روایت سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ سجدہ اپنے ہی کپڑے پر ہونا چاہئے ـــــ جیسا کہ بقول نووی ابوحنیفہ اور جمہور کا خیال ہے۔

۲۔ انس بن مالک ناقل ہیں کہ جب ہم دوپہر کو حضرتؐ کے ساتھ نماز پڑھتے تھے تو شدتِ حرارت سے بچنے کے لئے اپنے کپڑوں پر سجدہ کر لیا کرتے تھے۔"

(ابن ماجہ ۲/۲۱۶)

امام سندی نے اس کی شرح یوں کی ہے کہ کپڑوں سے مراد اپنے ہی کپڑے ہیں اس لئے کہ اس دور میں کپڑے کم تھے۔ الگ سے کپڑے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نمازی اپنے بدن کے کپڑوں پر سجدہ کر سکتا ہے جیسا کہ جمہور کا مسلک ہے۔

یہی ابن عباس کی اس روایت کا مطلب ہے کہ "میں نے رسول اکرمؐ کو اپنے کپڑے پر سجدہ کرتے دیکھا ہے۔" (ابویعلیٰ، مجمع کبیر، طبرانی)

امام بخاری نے صحیح ۱/۱۰۱ پر حسن کا یہ قول نقل کیا ہے کہ لوگ عمامہ اور ٹوپی پر سجدہ کیا کرتے تھے اور ہاتھوں کو آستینوں میں چھپا لیا کرتے تھے۔

اِنتباہ:

اس مقام پر ایک روایت اور بھی ہے جب لوگوں نے اسی صورت پر عمل کیا ہے حالانکہ اس میں کپڑے پر سجدہ کرنے کا ذکر نہیں ہے۔ روایت یہ ہے کہ ابن عباس راوی ہیں کہ میں نے رسولِ اکرمؐ کو سفید چادر میں ٹھنڈی زمین پر اس طرح نماز پڑھتے دیکھا ہے کہ آپ چادر کو ہاتھوں اور پیروں کے نیچے دبا لیا کرتے تھے۔"

یا بقول احمد: "میں نے بارش کے دن رسولِ اکرمؐ کو دیکھا کہ آپ مٹی سے بچنے کے لئے سجدہ کرتے وقت اپنی چادر کا سہارا لیا کرتے تھے اور اسے سجدہ کے وقت اپنے سامنے رکھ لیا کرتے تھے۔"

یا بروایت ثابت بن صامت : "رسولِ اکرمؐ نے مسجد بن الاشہل میں چادر اوڑھ کر نماز شروع کی اور اس کے بعد زمین کی ٹھنڈک سے بچنے کے لئے ہاتھ چادر پر رکھ دیا بالفاظِ دیگر) میں نے حضرتؐ کے سجدہ کے وقت دونوں ہاتھ کپڑے پر دیکھے ہیں" (ابن ماجہ ۱/۳۳۱، السنن الکبریٰ ۲/۱۰۸، نصب الرایۃ ۱/۳۸۶، نیل الاوطار ۲/۲۶۹-۲۷۰)

علامہ شوکانی کا تبصرہ ہے کہ اس روایت سے اندازہ ہوتا ہے کہ نمازی اپنے بدن کے کپڑے کے کناروں کا سہارا لے سکتا ہے لیکن عذر کی حالت میں چاہے وہ بارش کا عذر ہو یا گرمی اور سردی کا ____ روایت سے صاف ظاہر ہے کہ حضورؐ اپنے جسم مبارک کی چادر پر سجدہ فرمایا کرتے تھے۔

ہمارا اعتراض یہ ہے کہ روایت میں صرف ہاتھوں اور پیروں کی سردی میں کپڑے کا سہارا لینے کا ذکر ہے، سجدہ یا پیشانی کا کوئی اشارہ تک نہیں ہے اس لئے اس کو حضرت عائشہ کی اس روایت پر محمول کر دینا چاہیئے کہ "رسولِ اکرمؐ نماز کی حالت میں قدموں کے نیچے کچھ نہیں رکھتے تھے لیکن جب ایک دن بارش ہو گئی تو آپؐ نے زیرِ قدم ایک کھال بچھالی"

(طبرانی فی الاوسط، بیہقی ۲/۴۳۶، مجمع الزوائد ۲/۵۷)

مسند احمد ۴/۲۵۴ پر ایک مرفوعہ روایت محمد بن الربیعہ، یونس بن الحرث الطائفی ____ ابن عون ____ عون ____ مغیرہ بن شعبہ کے واسطے سے نقل ہوئی ہے کہ "حضرت رسول اکرمؐ دباغت کی ہوئی کھال پر نماز پڑھتے تھے یا اسے پسند فرماتے تھے"

(ابو داؤد ۱/۱۰۶، سنن بیہقی ۲/۴۲۰)

لیکن یہ روایت بالکل ضعیف ہے اور ایسی روایات سے احکام پر استدلال نہیں ہو سکتا ہے۔ روایت کے ضعیف ہونے کا سبب یہ ہے کہ اس میں یونس بن الحرث کا حوالہ ہے اور وہ بقول احمد "مضطرب الحدیث" اور بقول ابن احمد "میرے والد کی نظر میں ضعیف تھا" ابن معین اسے "لاشئ" اور ابو حاتم "غیر قوی" کہتے تھے۔

نسائی کے نزدیک "ضعیف۔ غیر قوی" اور ابن شیبہ کے قول کی بنا پر ابن معین شدّت سے ضعیف قرار دیتے تھے۔ ساجی کا خیال ہے کہ ضعیف تو تھا لیکن جھوٹا نہیں تھا۔
(تہذیب التہذیب ۱۱/۲۳۷۴)

اس کے علاوہ ابو عون عبید اللہ بن سعید ثقفی کوفی بھی ہے جو بقول ابو حاتم مجہول (الجرح والتعدیل)۔ اور بقول ابن حجر "مغیرہ سے مرسل روایت کرتا تھا۔" مزید یہ ہے کہ روایت میں سجدے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اور نماز اور سجدہ کوئی لازم و ملزوم بھی نہیں ہیں کہ جس چیز پر نماز ہو اسی پر سجدہ بھی ہو۔

قولِ فیصل:

صحاح و مسانید و سنن کی جملہ روایات کو نقل کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچنا ناگزیر ہو جاتا ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے اوّلاً و بالذّات سجدہ زمین پر ہونا چاہئے اور زمین ہی سے متعلق زمین سے اُگنے والی چیزیں ہیں جن کا کھانے یا پہننے میں استعمال نہ ہوتا ہو جیسے خُمرہ، حصیر، بساط وغیرہ۔ ان کے علاوہ بغیر کسی عذر کے کسی شے پر بھی سجدہ جائز نہیں ہے۔ ہاں عذر کی موجودگی میں کپڑے پر سجدہ کیا جا سکتا ہے لیکن اس میں بھی یہ شرط ہے کہ کپڑا اپنے بدن پر ہو، الگ سے نہ ہو۔ فرش، سجادہ، اونی جانمازیں، ریشمی مصلّی بطور سجدہ گاہ استعمال نہیں کئے جا سکتے۔ ان کے جواز پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ سجدہ سے متعلق تمام روایتیں درج کی جا چکی ہیں اور صحاح و سنن کی کسی بھی کتاب میں کوئی ایک روایت اس کے جواز کے سلسلے میں نہیں ہے۔ مختصر یہ ہے کہ تیسری صدی تک تالیف ہونے والی کتبِ احادیث میں اس موضوع پر کوئی ایک مسند، مرفوع، موقوف، مرسل روایت نہیں پائی جاتی تھی اس لئے فرش و سجادے پر سجدے کے جواز کا فتویٰ دینا یا مسجدوں میں انھیں سجدے کی غرض سے فرش کرنا ایک بدعتِ خالص ہے جس میں سنّت و سیرت کا شائبہ تک نہیں ہے۔ سنّتِ الٰہیہ اور سیرتِ پیغمبر اسلام قطعاً اس کی مخالف ہے اور ظاہر ہے سنّتِ الٰہیہ میں تبدیلی غیر ممکن ہے۔ خود حافظ کبیر

ابو بکر بن ابی شیبہ نے اپنے اسناد سے مصنف کی دوسری جلد میں سعید بن المسیب اور محمد بن سیرین سے روایت کی ہے کہ فرش پر نماز امر جدید ہے اور پیغمبرؐ کی صحیح حدیث میں وارد ہے کہ بدترین امور، جدید امور ہوتے ہیں جو بدعت کا درجہ رکھتے ہیں۔ رہ گیا خاکِ پاکِ کربلائے معلّٰی پر سجدہ تو یاد رکھئے کہ ——— خاکِ پاکِ کربلائے معلّٰی پر سجدہ اور اسے سجدہ گاہ قرار دینا دو اہم بنیادوں کی بناء پر ہے جن کا التزام شیعوں کے لئے انتہائی ضروری ہے اور وہ ان کے اساسی اصولوں میں داخل ہے۔

۱۔ ہر نمازی اس بات کا خواہش مند ہوتا ہے کہ اپنی نماز کے لئے ایسی خاک کا انتخاب کرے جس کی طہارت پر یقین رکھتا ہو چاہے وہ کسی زمین سے اٹھائی گئی ہو اور دنیا کے کسی خطے سے لائی گئی ہو۔ اس مسئلہ میں ہر خطہ برابر اور ہر گوشہ زمین مساوی ہے، اسی لئے نمازی اپنے ساتھ خاکِ پاکِ کربلا کی سجدہ گاہ رکھتا ہے کہ اس کی طہارت کا یقین ہے اور سفر و حضر میں دوسری جگہوں کی طہارت کے بارے میں بہر حال شبہ ہوتا ہے۔ ہر زمین کا پاک ہونا کوئی ضروری نہیں ہے اور ہر خاک کا قابلِ سجدہ ہونا کوئی لازمی نہیں ہے۔ خصوصیت کے ساتھ سفر کے موقع پر جہاں انسان مختلف شہروں، دیہاتوں، ہوٹلوں، مسافر خانوں، سرائے، اسٹیشن، ہوائی اڈے کا سامنا کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ ہر جگہ کی خاک کے بارے میں طہارت کا یقین پیدا نہیں کر سکتا ہے۔ کبھی یہاں مسلمان نازل ہوتے ہیں اور کبھی کفّار، کبھی محتاط لوگ آتے ہیں اور کبھی لاپرواہ۔ ایسی حالت میں طہارت کا یقین ناممکن ہے ——— اور سجدہ گاہ میں طہارت کا یقین اگرچہ شرط نہیں ہے بلکہ ہر خاک کو لاعلمی کے عالم میں طاہر ہی سمجھا جائے گا۔ لیکن اس میں کیا مضائقہ ہے کہ انسان ہمیشہ ایک سجدہ گاہ اپنے ہمراہ رکھے جس کی طہارت کا یقین ہو اور جس کی پاکیزگی کا اطمینان رکھتا ہو تاکہ بارگاہِ احدیت میں نجاست و کثافت سے الگ ہو کر سجدہ ریز ہو اور کسی قسم کی گندگی کا شائبہ اپنے قریب نہ آنے دے۔ خود شریعت نے بھی نمازی کے اعضاء، اس کے لباس اور مکان کے بارے میں طہارت کا بیحد اہتمام کیا ہے۔ مزبلہ، قصاب خانہ، مقبرہ، شارع عام، حمام،

اونٹوں کے بیٹھنے کی جگہ پر نماز کو مکروہ کر دیا ہے۔ مساجد کو طیب و طاہر اور پاک و پاکیزہ رکھنے کا حکم دیا ہے تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ لباس، مکان، اعضاء و جوارح کے بارے میں طہارت کا اعلیٰ اہتمام مستحسن ہے اور سجدہ گاہ کے بارے میں یہ اہتمام بدعت و ناجائز ہے ــــ العیاذ باللہ!

سجدہ گاہ کے بارے میں طہارت کا یہ اہتمام کوئی جدید شئے نہیں ہے بلکہ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی نظر میں بھی اس کی بڑی اہمیت تھی۔ وہ اس احتیاط کو انتہائی مستحسن خیال کرتے تھے جیسا کہ تابعی فقیہ، کبیر، مسروق بن الاجدع کے بارے میں شیخ المشائخ، امام السنۃ ابو بکر بن ابی شیبہ نے مصنف کی دوسری جلد میں سجدہ گاہ کے باب میں نقل کیا ہے کہ وہ سفر کرتے وقت کشتی میں ایک اینٹ اپنے ہمراہ رکھتے تھے اور اسی پر سجدہ کر لیا کرتے تھے ــــ یہی طریقہ اہلِ تشیع کا روزِ اوّل سے ہے اور وہ اسی کو اپنا مذہبی شعار بنائے ہوئے ہیں۔

۲۔ تجربیاتی قوانین سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ تمام زمینیں ایک درجہ کی نہیں ہیں بلکہ بعض کو بعض پر فضیلت حاصل ہے۔ کہیں آثار کے اعتبار سے اور کہیں حالات و کیفیات کے اعتبار سے۔ اسے علم طبیعیات کا جاننے والا ہر عاقل بھی تسلیم کرتا ہے اور عالمی حکومتیں بھی مانتی ہیں۔ خواص ہی سے زمینوں کی اہمیت بڑھتی ہے اور اسی سے حکومتی مقررات میں تفاوت قائم ہوتا ہے۔ حکومت کی زمینیں، حکومتی مراکز و دفاتر کی اراضی، قصرِ شاہی سے متعلق علاقے کہیں زیادہ اہمیت رکھتے ہیں، ان کا پاس و لحاظ پوری قوم پر ضروری ہوتا ہے۔ ان کے بارے میں قوانین کا احترام ہر ملکی کا فرض ہوتا ہے ــــ اور جب دنیاوی قوانین میں حکومتی اراضی کو ایک خصوصیت حاصل ہے تو شرعی قوانین میں خدائی زمینوں کا بھی ایک خاص درجہ ہوگا، اس کے اصول و آداب ہوں گے جن کا لحاظ ہر اُس شخص کا فرض ہوگا جو اپنا سرِ نیاز اس کی بارگاہ میں خم کرتا ہے اور زیرِ پرچم توحیدِ زندگی گذارتا ہے۔ اسی بنیاد پر کعبہ کو ایک خاص مقام حاصل ہوا ہے۔ حرم کو ایک عظیم خصوصیت ملی ہے۔ مساجد و معابد کا مخصوص احترام و

اکرام کیا گیا ہے۔ ان کی طہارت و نجاست کا لحاظ رکھا گیا ہے وہاں مجنب و حائض و نفساء کے داخلہ پر پابندی لگائی گئی ہے۔ اس کی بیع و شراء ہر حال میں حرام رکھی گئی ہے جب کہ دوسرے اوقاف کے بیچنے کا ہر حال میں جواز موجود ہے۔

مکہ معظمہ حرم الٰہی ہے۔ اس کی طرف رُخ کرنا ضروری ہے۔ وہ حج کا مرکز ہے۔ وہاں کے مناسک ضروری ہیں۔ وہاں کی گھاس تک کا احترام ضروری ہے ـــــ اور یہ سب صرف اس لئے کہ نسبتوں میں بڑی عظمتیں پائی جاتی ہیں اور اللہ نے اسے تمام زمینوں میں منتخب قرار دے دیا ہے۔

یہی حال مدینہ منورہ کا ہے کہ وہ حرم رسولؐ محترم ہے۔ وہاں کی زمین، رہنے والے، دفن ہونے والوں کا ایک خاص شرف ہے جس کا راز اس کے پروردگار کی طرف منسوب ہونا اور رسولِ اعظمؐ کا پایۂ تخت ہونے کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

قانونِ اضافت و نسبت جس طرح صرف ایک شرعی امر نہیں ہے بلکہ فطری قانون بھی ہے اسی طرح اس کا تعلق صرف زمین ہی سے نہیں ہے بلکہ ہر اس شئے میں جاری ہے جس میں تفاوت اور پستی و بلندی فرض کی جاسکتی ہے۔ چاہے وہ انبیاء و مرسلین، اوصیاء و اولیاء، صدّیقین و شہداء، مومنین و متقین ہی کیوں نہ ہوں، ان میں بھی یہ تفاوت پایا جا رہا ہے۔ اور یہ تفاوت پورے دائرۂ وجود کا محور بنا ہوا ہے۔ اسی سے ہر شئے کا قیام اور اسی کی طرف رغبتوں کی توجہ ہے۔ تعلقات کی بنیاد بھی یہی نسبت ہے اور دشمنی و عداوت کی جڑ بھی یہی نسبت ہے!۔ اتحاد و صلح و سلام و امان اسی سے قائم ہوتا ہے اور اختلاف و افتراق و انشقاق بھی اسی سے ہے ـــــ اجتماعی مراکز اور دولت و حکومت کی تشکیل بھی نسبت سے ہوتی ہے۔ اور باہمی تنازع و اختلاف، معرکہ آرائی و خوں ریزی بھی اسی سے قائم ہوتی ہے۔ دین و دنیا کے مسائل کے ادارے، معاشرتی حالات کے مراکزِ علمی، اجتماعی، قبائلی، قومی، جماعتی، حربی اور سیاسی بست و کشاد، ملکی حرکت و سکون، افتراق و اتحاد جیسے اہم مسائل کی بنیاد نسبت ہی پر قائم ہوتی ہے۔ اسی لئے ماننا پڑے گا کہ عالم کی قوی و قاہر و جبّار حکومت جس کی ہمہ گیری

اور وسعت بشریت کے روز ازل سے ابد الآباد تک پھیلی ہوئی ہے اور اس کے دائرۂ اقتدار سے کوئی شئے خارج نہیں ہے، صرف "پائے نسبتی" کے ہاتھ میں ہے۔ اسی سے دین و دنیا کا قیام اور اسی پر انسانی تنظیم اور اجتماعی و انفرادی قانون کی انتہا ہے۔ انسان اپنی پوری کثرت کے ساتھ روزِ ازل سے اسی کے ساتھ چل رہا ہے، اسی کی سلطنت میں آباد اور اس کی زنجیروں میں مقید ہے۔ نہ اس سے جائے مفر ہے اور نہ اس کے قیود سے امکانِ آزادی، جوڑ توڑ، شکست و بست، بلندی و پستی، وصل و فصل، قرب و بعد، اخذ و عطا، عزت و ذلت، ثواب و عقاب، حقارت و تعظیم سب ہی کی بنیاد یہی ایک "پائے نسبتی" ہے۔

یہی "پائے نسبتی" ہے جس نے "نامعلوم سپاہی" کو مکرم و معظم و محترم بنادیا ہے۔ اسی کے بل بوتے پر اس کی تعظیم و تجلیل و تکریم ہوتی ہے۔ اسی کے صدقہ میں اس کی قبر پر پھول چڑھائے جاتے ہیں اور اسی کے طفیل میں اس کا ذکر صفحۂ تاریخ پر باقی و سرمدی ہے۔

پائے نسبتی ہی کا صدقہ ہے کہ انسان عظیم مصائب کو سہل اور شدید مشکلات کو آسان سمجھ لیتا ہے۔ مصیبتوں سے ٹکرانا کھیل اور نفس و مال کی قربانی تماشہ بن جاتی ہے۔ یہی نسبت تھی جس کی وجہ سے حضورؐ سرورِ کائنات اپنے صحابی عثمان بن مظعون کی میت کو بوسہ دے رہے تھے اور آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے جیسا کہ ام المومنین عائشہ نے روایت کی ہے۔ (امالی ابو القاسم عبد الملک بن بشران، مسند علی ابن الجعد الجوہری جزو عاشر، مستدرک جزو ثالث وغیرہ۔)

یہ نسبت ہی تھی جس کی بنیاد پر سرورِ کائناتؐ اپنے فرزند حسینؑ کو رو دیا کرتے تھے، وقتاً فوقتاً صفِ ماتم بچھاتے تھے اور خاکِ کربلا سونگھتے تھے۔ یہی نسبت تھی جس نے صدیقہ طاہرہ فاطمہ زہراؑ کو بابا کی قبر مبارک کو سونگھنے پر آمادہ کیا تھا۔

یہی نسبت تھی جس نے روزِ جمل بنی ضبہ کو عائشہ کے اونٹ کی مینگنیوں کے جمع کرنے اور سونگھنے کی دعوت دی تھی۔ (طبری)

یہی نسبت تھی جس نے کربلا میں امیر المومنین ؑ کو خاکِ صحرا کو سونگھ کر آنسو بہانے پر مجبور کر دیا تھا اور آپ اعلان کر رہے تھے کہ اس سرزمین سے ستر ہزار افراد محشور ہوں گے جو بلا حساب جنت میں جائیں گے۔ (طبرانی، مجمع الزوائد ۹/ ۱۹۱ ,روایت رجال ثقات)

یہی نسبت تھی جس نے بنی اسد کو خاکِ کربلا سونگھنے پر آنسو بہانے کی دعوت دی تھی جیسا کہ ہشام بن محمد نے نقل کیا ہے کہ قبر الحسین ؑ پر نہر کھودنے کی سازش کے چالیس روز بعد جب پانی خشک ہو گیا اور نشانِ قبر کا ملنا مشکل ہو گیا تو بنی اسد کا ایک شخص آیا اور اس نے ایک ایک مٹھی خاک لے کر سونگھنا شروع کیا اور ایک منزل پر فیصلہ کر دیا کہ یہ خاکِ قبرِ حسین ؑ ہے۔

"میرے ماں باپ قربان اے حسین ؑ! آپ کی زندگی بھی طیب و پاکیزہ تھی اور آپ کی خاکِ قبر بھی طیّب و پاکیزہ ہے۔ لوگوں نے چاہا تھا کہ نشانِ قبر کو مخفی کر دیں لیکن خاکِ قبر کی خوشبو نے قبر کی نشان دہی کر دی۔"

(ابن عساکر ۴/ ۳۴۲، کفایہ گنجی ص ۲۹۳)

مختصر یہ کہ انسان جہاں بھی رہے جیسا بھی رہے، جس نسل و خاندان کا بھی ہو، جو شکل و صورت بھی رکھتا ہو اپنے ہر دورِ حیات میں اس یائے نسبتی کے زیرِ فرمان اور اس کے شکنجوں میں اسیر ہے۔ اس کی زبان پر اس حکومت کا کلمہ ضرور رہے گا۔ وہ میری روح، میرا بدن، میرا مال، میرے اہل، میرا بیٹا، میرے اقربا، میرا خاندان، میرا قبیلہ، میری تجارت، میری ملت، میری قوم، میری جماعت، میرا ابعداد، میرا گھر، میرا ملک، میری حکومت، میرے قائد، میرے سردار جیسے الفاظ استعمال کرتا رہے گا اور جب اسی کو جمع کی شکل میں استعمال کرے گا تو اجتماعات وجود میں آجائیں گے ـــــ حکومت ـــــ سلطنت ـــــ جماعت ـــــ انجمن ـــــ عشیرہ ـــــ قبیلہ ـــــ قوم ـــــ ملت ـــــ مذہب ـــــ طائفہ ـــــ سب اسی ایک نسبت کے آثار ہیں۔ اس کے آتے ہی آثار پیدا ہونے لگتے ہیں اور ناقابلِ التوار احکام نافذ ہونے لگتے ہیں۔

نسبت کی بحث انتہائی مفید بحث ہے اس سے سیکڑوں اجتماعی مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ مذاہب و عقائد، محبت و عداوت، مسائلِ شریعت، فلسفۂ تقرب، حقیقتِ شعائر اللہ، مقاماتِ مقدسہ، امکنۂ محترمہ کے تمام مسائل نسبت ہی سے وابستہ ہیں۔

اسی ایک نسبت سے خاکِ کربلائے معلّٰی کی عظمت کا اندازہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ کربلا دینِ خدا کے احیاء کا میدان اور صاحبِ کربلا اللہ کا قریب ترین بندہ ہے۔ خاکِ کربلا شہیدِ راہِ خدا کا مدفن، لشکرِ اسلام کے قائد کی آرام گاہ ہے۔ یہاں حبیب ابن حبیب، داعی الی اللہ، رہنمائے راہِ خدا، مجاہد فی سبیل اللہ قربانیوں کا شہنشاہ، اسلام کا سر بکف مجاہد، اعلاءِ کلمۃ الحق کا خوگر، نشرِ توحید کا ذمہ دار، بقائے احکام کا ضامن آرام کر رہا ہے۔

آخر وہ دنیا کا کون سا ملک اور مملکت کی وہ کون سی سرزمین ہے جس میں ایسا قائدِ اعظم طاہر کریم، وفادار، صادق، غیرت مند، شریف محوِ استراحت ہو جیسا کہ قائدِ اخلاص سرزمینِ کربلا پر محوِ استراحت ہے ــــ یعنی حسینؑ ــــ فدیۂ راہِ خدا۔

آخر قدرت حسینؑ پر کیوں کر فخر نہ کرے، ان کے خون کو اپنے خزانے میں کیوں کر محفوظ نہ رکھے۔ ان کے خونِ مقدس کے کسی بھی قطرے کو کیوں کر واپس آنے دے۔ ان کے تذکرے کو ارض و سماء میں کیوں کر عام نہ کر دے جب کہ حسینؑ کا سراپا وجود اسی کی محبت میں سرشار اور راز سرتاپا اس کی الفت کا مجسمہ تھا۔

ایسی حالت میں ضروری تھا کہ عاشور کے دن دنیا سیاہ ہو جاتی ــــ غضبِ الٰہی کے آثار پورے صفحۂ وجود پر نمایاں ہو جاتے ــــ ارض و سماء ان کا ماتم کرتے، آسمان سے خون برستا ــــ جیسا کہ بقول ابن سیرین وقوع پذیر بھی ہوا۔

قدرت نے ملائکہ مقربین کے ذریعہ خاکِ کربلا بھیجی ــــ رسولِ اعظمؐ نے اس کو اہتمام کیا ــــ زندگی بھر اس کی داستان دہراتے رہے اور اپنے زخمِ جگر کا مرہم بنائے رہے۔

اے مسلمِ صادق! کیا ایسی حالت میں خاکِ کربلا پر سجدہ روا نہیں ہے۔ کیا یہ مناسب نہیں ہے کہ جملہ نمازوں اور لیل و نہار کی تمام ساعتوں میں اسے پیشِ نظر رکھا جائے جب کہ

وہ زمین، دنیا کی ہر زمین، ہر خاک، ہر علاقہ، ہر خطہ، ہر فرش و سجادے سے افضل و اعلیٰ ہے اور فرش و سجادہ پر سجدہ کرنے کی کوئی دلیل بھی نہیں ہے۔

کیا یہ خاکِ پاک تقربِ الٰہی کا ذریعہ ــــ خشوع و خضوع کا وسیلہ ــــ بندگی کا مظہر ــــ اور اس بات کی اہل نہیں ہے کہ رخسار و پیشانی کو اس پر رکھ کر مقدساتِ اسلامیہ کے دفاع اور ناموسِ دین کے تحفظ کی یاد تازہ کی جائے۔

کیا اس تربتِ مقدسہ میں جملہ اسرارِ سجدہ موجود نہیں ہیں جس میں غیرتِ اسلامیہ، عظمت و کبریائی خداوندی، بندگی و سپردگی کے جملہ مظاہر پائے جاتے ہیں؟ کیا وہ سرزمین سجدہ کی حقدار نہیں ہے جس میں توحید کے دلائل، قربانی کے آثار، رقتِ قلب، رحمتِ شفقت۔۔۔ عطوفت کے انوار جلوہ گر ہیں۔ کیا یہ افضل و بہتر نہیں ہے کہ اس خاک مبارک کو سجدہ گاہ قرار دیا جائے جس پر اس خون کا سرچشمہ جاری ہوا ہے جس میں محبتِ الٰہیہ کا رنگ اور اخلاصِ توحید کی کیفیت نمودار ہے۔

یہ وہ خاک ہے جس کا خمیر حسینؑ کے خون سے اٹھا ہے ــــ وہ حسینؑ جسے ربِ جلیل نے طیب و طاہر بنایا ہے، جس کی محبت کو اجرِ رسالت قرار دیا گیا ہے۔ یہ وہ خاک ہے جس میں سید شبابِ جنت کا لہو جذب ہے جس میں اُمت کے پاس رسولِ اکرمؐ کی امانت سپرد ہے۔

یہی دو اہم بنیادیں "قانونِ احتیاطِ طہارت" اور "اصولِ اعتبارِ نسبت" ہیں جن کی وجہ سے ہم خاکِ کربلائے معلّٰی کی سجدہ گاہ بناتے ہیں جیسا کہ فقیہ السلف مسروق بن الاجدع کیا کرتے تھے اور اپنے ہمراہ مدینہ منورہ کی خاک کی سجدہ گاہ رکھا کرتے تھے، جب کہ وہ مسلمانوں کی "خلافتِ راشدہ" کے شاگرد اور مدینہ کے فقیہ و معلمِ سنت تھے۔ ان کے عمل میں بدعت کا احتمال بھی نہ تھا۔ وہ سنتِ خدا اور رسولؐ کی مخالفت نہیں کر سکتے تھے ــــ پھر ان دونوں بنیادوں میں کون سی بنیاد ایسی ہے جو قرآن کریم کی مخالفت اور سنتِ خدا اور رسولؐ کے منافی ہو؟ کس بنیاد کو بدعت کہا جا سکتا ہے اور کس میں نقص و رخنہ کیا جا سکتا ہے؟ کس کو عقل و منطق کے خلاف اور اصول و اعتبار سے متضاد قرار دیا جا سکتا ہے۔

ظاہر ہے کہ خاکِ کربلا کی سجدہ گاہ بنانا شیعوں کی نظر میں حتمی فریضہ نہیں ہے اور نہ شرع و

دین نے اسے واجب و لازم قرار دیا ہے۔ سلف سے خلف تک کسی بھی فقیہ نے سجدہ کے مسئلہ میں زمینوں میں فرق نہیں کیا ہے اور نہ کسی زمین پر سجدہ کو جائز اور کسی پر ناجائز ٹھہرایا ہے۔ یہ سب ان لوگوں کے تصورات ہیں جو شیعیت اور اس کے اصول سے ناواقف ہیں۔ ان کی نظر میں حقیقت کھل کر جلوہ گر نہیں ہوئی ورنہ وہ یہ سمجھتے کہ خاکِ کربلا پر سجدہ صرف ایک عقلی استحسان ہے جس میں افضل و اعلیٰ کے اختیار کو بہرحال بہتر قرار دیا گیا ہے ـــــ ورنہ کتنے دیندار حضرات ایسے ہیں جو سفر کے موقع پر اپنے ساتھ غیر خاکِ کربلا کی سجدہ گاہ یا پاکیزہ چٹائی وغیرہ رکھتے ہیں اور اسی پر سجدہ کر لیتے ہیں تاکہ دونوں میں سے کم از کم ایک بنیاد یعنی اصول احتیاط کا تحفظ ہو سکے۔

میری نظر میں تو مدینۂ منورہ اور مکۂ معظمہ کے مقدس حرم کے باشندوں کے لئے یہ کہیں زیادہ مناسب ہے کہ وہ ان پاکیزہ مٹیوں سے سجدہ گاہیں تیار کریں اور ان پر حضر میں بھی سجدہ کریں اور سفر میں بھی اپنے ہمراہ رکھیں تاکہ عرب کی ریگستانی گرمی اور تپش سے بھی محفوظ رہیں اور طہارت کا مکمل اہتمام بھی اس سے ہو سکے جیسا کہ فقیہ السلف مسروق کا طریق کار تھا۔

بلکہ اس سے زیادہ مناسب یہ ہے کہ ان سجدہ گاہوں کو وہاں تک جانے والے حجاج و زائرین تک بھی پہنچائیں تاکہ اُمتِ اسلامیہ اس پر سجدہ کرے اور اس کے طفیل میں اس ارضِ مقدس کی یاد دل میں محفوظ رکھے جو وحی کا مرکز اور تنزیل کی منزل تھی۔ جس سے نبوت کی یادیں وابستہ ہیں، جس کی خاک میں توحید و رسالت کی خوشبو بسی ہوئی ہے جو اہلِ ایمان کے گھروں کا نور اور اربابِ عقل کے دلوں کی روشنی ہے۔ جس سے مسلمان ہر گوشۂ دنیا میں تقرب کے مسائل مہیا کر سکتا ہے اور دارِ امن و حرمت و عافیت و کرامت کی یاد تازہ رکھ سکتا ہے۔

اس کے علاوہ یہ طریقہ کار اس ارضِ مقدس، حرمِ خدا اور دیارِ رسولؐ کی عظمت کا اشتہار بھی ہے اور شعائر اللہ کی حرمت و تکریم بھی۔

"وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمَاتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ
وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَائِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ"۔

حرفِ آخر

یہ ہے ہماری محبت کا راز ـــــ اور یہ ہیں ہمارے حسینؑ !

یہ ہے ہمارا ماتم ـــــ اور یہ ہے ہماری کربلا !

یہ ہے ہماری خاکِ پاک ـــــ اور یہ ہے ہماری سجدہ گاہ !

ہم اللہ کے بندے ہیں ـــــ اور وہ ہمارا رب ہے !

حضرت محمدؐ ہمارے رسول ہیں اور ان کی سیرت وسنت ہماری سیرت وسنّت ہے ! وللہ الحمد

"آخر حق کے آنے کے بعد ہم اللہ پر کیوں ایمان نہیں لاتے جب کہ یہ طمع بھی رکھتے ہیں کہ خدا ہمیں قوم صالحین میں داخل کرلے۔"

(سورۂ مائدہ آیت ۸۴)

"یہ سب اس لئے ہے کہ اہلِ علم اسے حق سمجھ کر اس پر ایمان لے آئیں اور ان کے دل جھک جائیں۔ خدا تو ایمان والوں ہی کو صراطِ مستقیم کی ہدایت کرتا ہے۔"

(سورۂ حج آیت ۵۴)

ختم شد